فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۹۵

از جنوری ۱۹۶۵ء تا جون ۱۹۶۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	جناب سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے، بی ٹی ایچ (علیگ) لکچرار شعبۂ عربی و نکیٹشور یونیورسٹی	۵۲
۲	جناب مولانا احمد علی صاحب لاہوری	۶۷
۳	جناب زیدی جعفر رضا صاحب. ایم اے شعبۂ سنسکرت و ہندی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۰۹-۱۳۱، ۲۷۱-۳۶۵، ۴۳۶
۴	جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش	۵-۱۳۱، ۴۰۵
۵	جناب سید شمیم احمد صاحب ڈھاکہ	۲۲۵
۶	جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین	۲۳-۳۶۱
۷	جناب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند	۸۵-۲۰۳، ۲۴۵-۳۲۵، ۴۳۱
۸	جناب عبد الرزاق صاحب قریشی رفیق انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی	۳۴۲
۹	جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی	۱۸۶
۱۰	جناب عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحوم	۱۴۸
۱۱	جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب. ایم اے استاد عربی الہ آباد یونیورسٹی	۲۸۹
۱۲	جناب مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ	۴۷۰
۱۳	جناب محمد ایوب صاحب قادری ایم اے	۵۳

نمبر شمار	اسماے گرامی	صفحہ	نمبر شمار	اسماے گرامی	صفحہ
۱۴	جناب الحاج قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت ایم اے دھینگ، شاہجہاں پور	۵۹	۲	نیب، جناب ڈاکٹر ماتا پرشاد صاحب استھانہ نیب بریلوی	۳،۴
			۳	جناب مولوی عثمان احمد صاحب جونپوری	۴،۴
۱۵	جناب مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی	۷۸-۱۵۷، ۳۱۶-۳۹۷، ۴۷۵	۴	جناب فضا ابن فیضی	۳۱۳
۱۶	شاہ معین الدین احمد ندوی:	۲-۸۲-۱۶۲-۱۶۵، ۲۴۲-۳۲۲-۴۰۳	۵	جناب نکہت شاہجہانپوری صدر شعبہ فارسی و اردو، جی ایف کالج، شاہجہانپور	۷۵
۱۷	جناب پروفیسر حکیم نیر واسطی لاہور	۱۳۸-۴۵۶			
۱۸	جناب وحید الدین خاں صاحب اعظم گڈھ	۳۰۱	۶	نیاز جناب محمد نیاز صاحب نیاز اعظم آبادی	۲۳۶
	شعراء		۷	جناب یحیی اعظمی	۲۳۶، ۳۱۵
۱	جوہر جناب چندر پرکاش صاحب جوہر بجنوری	۷۶		~~~~~~	

فہرست مضامینِ معارف

جلد ۹۵

از جنوری ۱۹۶۵ء تا جون ۱۹۶۵ء

بہ ترتیب حروف تہجی

شمار	مضمون	صفحہ	شمار	مضمون	صفحہ
	شذرات	۲-۸۲-۱۶۲-۲۴۲-۳۲۲-۴۰۲	۷	ذخیرہ ہادی بلگرامی کے چند مخطوطات	۱۰۹
			۸	ساقی نامہ	۳۴۲
	مقالات		۹	شبلی (انسان، مصنف، مصنف گر)	۱۸۶
۱	اسلام مغربی لٹریچر میں	۳۱	۱۰	شیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبد اللہ ابن سینا اور اسکی تصانیف پر ایک مطالعاتی نظر	۴۵۶
۲	اسلام میں دوسرے مذاہب اور اہل مذاہب کی حیثیت	۱۶۵			
۳	اقبال کا تصور زماں	۵	۱۱	علامہ جلال الدین سیوطی	۸۵-۲۰۳، ۲۴۵-۳۲۵، ۴۲۱
۴	امام ابو یوسف اور ان کے فقہی و قانونی کارنامے	۳۶۱	۱۲	کلام اجمل یعنی مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی فارسی شاعری	۱۳۸
۵	حافظ ابن کثیر	۲۳			
۶	خیر التواریخ کی روداد طباعت	۵۹	۱۳	محمد بن تغلق کی فلسفہ پرستی	۱۳۱

شمار	مضمون	صفحہ	شمار	مضمون	صفحہ
۱۴	مسلم علم الہیئت کا اجمالی جائزہ	۴۰۵		ادبیات	
۱۵	مناقب الاصفیاء	۲۲۵			
۱۶	مولانا نور ترک دانشمند اور قرامطہ	۲۸۹	۱	جشن جبلی	۲۳۶
۱۷	نقد النثر کا مصنف اور کتاب کے	۵۲	۲	شہرستان ادب آگہی (دار المصنفین)	۳۱۳
	مباحث و خصوصیات		۳	غزل	۷۶، ۴۷۳-۴۷۴
۱۸	ہندی شاعری کا ایک تاریخی جائزہ	۲۷۱-۳۸۵، ۴۳۶	۴	قطعۂ تہنیت بر ورود مسعود	۳۱۵
	آثار علمیہ و ادبیہ			علیا حضرت ساجدہ سلطان صاحبہ	
۱	مکاتیب عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحوم	۱۴۸		نواب بیگم بھوپال	
۲	مکاتیب مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب	۴۷۰	۵	مدنی دربار میں (بہ تلمیحات قرآنی)	
۳	مکتوب مولانا احمد علی صاحب لاہوری	۶۷		مطبوعات جدیدہ :	۷۷-۱۵۷-۲۱۶-۳۹۷-۴۷۵

جلد ۹۵ - ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۶۵ء - عدد ۱

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۲-۴

مقالات

اقبال کا تصور زمان — جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش — ۵-۲۲

حافظ ابن کثیر — جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین — ۲۳

نقد النثر کا مصنف اور کتاب کے مباحث و خصوصیات — جناب سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے پی ایچ ڈی (علیگ) لکچرار شعبۂ عربی ونکٹیشورا یونیورسٹی — ۵۲

شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی (استدراک) — جناب محمد ایوب صاحب قادری ایم اے — ۵۳-۵۸

خیر التواریخ کی روداد طباعت — جناب الحاج قاری محمد بشیر الدین پنڈت صاحب ایم اے (علیگ) شاہ جہاں پور — ۵۹-۶۶

آثار علمیہ و ادبیہ

مکتوب مولانا احمد علی صاحب لاہوری بنام مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم — ۶۷-۷۴

ادبیات

مدنی دربار میں (بہ تلمیحات قرآنی) — جناب نکہت شاہ جہاں پوری، صدر شعبۂ فارسی و اردو جی ایف کالج شاہ جہان پور — ۷۵

غزل — جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری صاحب — ۷۶

مطبوعات جدیدہ — م - ع — ۷۷-۸۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے ۲۴ر دسمبر کو مولانا صبغۃ اللہ صاحب شہید فرنگی محلی نے انتقال فرمایا، مرحوم ایک نامور عالم، لائق مدرس، خوش بیان خطیب، شگفتہ نگار ادیب اور خوش فکر شاعر تھے، انکی تقریریں خصوصیت کے ساتھ بڑی موثر اور دل آویز ہوتی تھیں، عرصہ تک مدرسہ نظامیہ میں درس و تعلیم کی خدمت انجام دی، ایک زمانہ میں النظامیہ کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا تھا، انجمن خدام کعبہ کے بھی عہدہ دار اور اس کے اخبار خادم الحرمین کے اڈیٹر رہے، خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا تھا، پھر لیگ میں شامل ہوگئے تھے، آداب و اخلاق میں قدیم تہذیب و شائستگی کا نمونہ، بڑے وضعدار خوش مذاق، بذلہ سنج اور علم مجلسی کے ماہر تھے، ضلع جگت سے بھی ذوق رکھتے تھے، غرض انکی ذات میں بڑی جامعیت تھی، ان کی وفات سے بہت سی خصوصیات کا خاتمہ ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

جنرل ایوب خاں کی کامیابی درحقیقت پاکستان کے مصالح اور اہل پاکستان کے سیاسی شعور کی کامیابی ہے، انھوں نے جس طرح پاکستان کی گرتی ہوئی عمارت سنبھالی اور اس کو استحکام بخشا اس سے انکے مخالفین بھی انکار نہیں کرسکتے، ان کی مخالفت انہی اشخاص اور پارٹیوں نے کی جن کو ان کے دور میں حصولِ اقتدار کا موقع نہیں مل سکا یا اس سے محروم ہونا پڑا، سیاست میں تو سب کچھ روا ہے، لیکن حیرت ان علمائے کرام پر ہے جنھوں نے مس جناح کی حمایت میں دین و شریعت کی کیسی کیسی مضحکہ انگیز تاویلیں کیں، یہی وہ علما ہیں جو موجودہ دور کی خالص دنیاوی سیاست میں دین کو لا کر خود بھی اپنا وقار کھوتے ہیں اور دین و شریعت کا احترام بھی مجروح کرتے ہیں، انہی کی

فتویٰ بازیوں سے جدید طبقہ میں دین سے بدگمانی پھیلتی ہے، تاہم یہ مقابلہ اس حیثیت سے مفید رہا کہ آئندہ جنرل ایوب خاں اپنی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے، اور ان کا دوسرا دورِ صدارت پہلے سے زیادہ بہتر ہوگا، دیکھنا یہ ہے کہ مس فاطمہ جناح جیسی حامیِ دینِ متین کی ناکامی کے بعد علمائے کرام اب جمہوریت اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی کیا تدبیر اختیار کرتے ہیں۔

ابھی یہ سطر ختم ہوئی تھیں کہ کراچی کے خونریز فساد کی اطلاع ملی، اس نے جنرل ایوب کی کامیابی کو داغدار کردیا، یہ خونیں فساد انتہائی افسوس ناک بلکہ شرمناک ہے، اور اس سے پاکستان نے ایک بڑی بری مثال قائم کی ہے، خدا اہل پاکستان کو راہ راست پر لائے۔

دار المصنفین کی جوبلی کے انتظامات مکمل ہوگئے ہیں، جن لوگوں کو دعوت نامے بھیجے گئے ہیں، قریب قریب سب نے شرکت کا وعدہ کیا ہے، اور امید ہے کہ انشاء اللہ اس تقریب میں ہندوستان کے اکابر اور فضلاء و اہل علم کا اچھا اجتماع ہوگا، لائف ممبری کا سلسلہ جوبلی تک جاری رہے گا، جن ممبروں کی فیس وصول ہوچکی ہے ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں: بھوپال میں ہز ہائنس نواب ساجدہ سلطانہ صاحبہ، ان کے صاحبزادے ہز ہائنس نواب محمد منصور علی خاں نواب آف پٹودی، چیف ٹرسٹی اوقاف شاہی، نوابزادی ثریا رشید صاحبہ، جمال افتخار صاحب گلو فیکٹری، ڈاکٹر عادل محمد خاں صاحب، فخر الدین صاحب سکریٹری سیفیہ کالج، امیر دار العلوم تاج المساجد، حفیظ اللہ خاں صاحب بمبئی اسٹور، حافظ عبد الباسط خاں صاحب بون مل، کالے خاں صاحب بیڑی مرچنٹ،

بمبئی کے ممبروں کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حاجی قاسم صاحب آگبوٹ والا، بیرپادا حاجی عبد الرحمن شاہ صاحب درگاہ ٹرسٹی، محسن طیب جی صاحب، یوسف مراد صاحب مراد اینڈ کو، خوجہ خان محمد حبیب بھائی اسکول ٹرسٹ، حسین بھائی احمد بھائی، حبیب بھائی ٹرسٹ، اے ستار عمر صاحب انڈیا ہاؤس،

ڈاکٹر اے کے نائک صاحب، شاہ محمد صاحب ناظم مسجد اہل حدیث مومن پورہ، حاجی احسان اللہ صاحب بستوی، آٹھ دس ممبروں نے اپنا نام ظاہر کرنے کی ممانعت کی ہے۔ ان کے علاوہ اعظم گڈھ کے مقیم بمبئی احباب نے تین ہزار متفرق چندہ جمع کیا، ابھی کئی لائف ممبروں کی رقم وہیں جمع ہے، اور بعض موعودہ رقموں کی وصولی کے بعد جب کل رقمیں آجائیں گی تو باقی لائف ممبروں کا نام لکھا جائے گا

حکومت کشمیر نے بھی جوبلی کے لیے پانچ ہزار کا عطیہ دیا ہے، ایک مشہور فاضل اور دار المصنفین کے پرانے مخلص نے یورپ سے گیارہ سو کی رقم بھیجی ہے، لیکن اپنے نام کے اظہار کی ممانعت کی ہے، مدراس میں جسٹس عبد الرشید صاحب اور مولانا محمد یوسف کوکن صدر شعبہ اسلامیات مدراس یونیورسٹی نے دار المصنفین کی کل کتابوں کے کئی خریدار فراہم کیے ہیں۔ دار المصنفین ان سب محسنوں کا شکر گذار ہے۔

دنیا کو ہدایت الٰہی کا آخری اور ابدی پیغام ہجرت نبویؐ سے ۱۳ سال پہلے ملا تھا، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی سنہ ۱۳ قبل ہجرت نازل ہوئی تھی، جو عالم انسانیت کا اہم بالشان واقعہ ہے اور جس نے پوری دنیا پر اثر ڈالا، اس وقت سنہ ۱۳۸۴ھ ہے، چار سال کے بعد پورے چودہ سو سال ہوجائینگے اس لیے بعض اہل دل واصحاب علم و نظر کی تجویز ہے کہ سنہ ۱۳۸۸ھ میں اس کو شایان شان طریقہ سے منایا جائے، اور ابھی سے اس کی تیاری کیجائے، اس قسم کی یادگار منانا اب ایسی رسمی چیز بن گئی ہے کہ اس میں ظاہری باتوں کے سوا یادگار کی اصل روح سے بہت کم تعلق ہوتا ہے، اس لیے ایسی تجویزوں کی تائید کرتے ہوئے طبیعت ہچکچاتی ہے، لیکن اگر اس کی روح اور مقصد کو سامنے رکھکر مناسب طریقہ سے منایا جائے تو اس کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اور اسکے ذریعہ اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کا بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔

مقالات

اقبال کا تصورِ زمان

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

[اعتذار: مضمون کی اس قسط کے لیے قارئین کرام کو غیر معمولی انتظار کرنا پڑا جس کے لیے مجبوری تھی، نیاز صاحب کی بعض گلفشانیاں مقتضی تحقیق تھیں، مگر اقبالیات پر ضروری لٹریچر یہاں نایاب تھا، میں محترم المقام جناب پروفیسر ایم ایم شریف صاحب کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے ازراہ نوازش ادارہ ثقافت اسلامیہ کی لائبریری سے ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم مرحوم کی "فکر اقبال" کا ایک نسخہ مجھے مستعار بھجوایا۔ "فکر اقبال" سے نیاز صاحب کی ایک گلفشانی کی سند تو مل گئی مگر ان نئے حقائق کا بھی انکشاف ہوا۔ علامہ اقبال کے نظریۂ زمان کے متعلق نیاز صاحب کا یہ "وقیع اور مبصرانہ" مقالہ خلیفہ صاحب کی جگر کاویوں سے اڑایا ہوا ہے، جس سے اخذ و استفادہ کا انھوں نے ذرا سا بھی اشارہ نہیں کیا۔ فیا للعجب]

۸۔ نیاز صاحب نے لکھا ہے:۔

"اقبال نے زمانۂ قیام یورپ میں اس موضوع پر ایک مختصر سا مضمون لکھا تو ان کے اساتذہ نے اسے ایک لایعنی اُپج کہہ کر ٹال دیا لیکن بعد کو جب برگسان نے اس موضوع پر اپنے پُر زور دلائل پیش کیے تو اہل نظر چونک پڑے۔"

نیاز صاحب نے اپنے دعوے کی سخافت کو چھپانے کے لیے ابہام کا سہارا لیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ

بقول نیاز صاحب، اقبال نے جس موضوع پر وہ مزعومہ مضمون لکھا تھا، کیا تھا؟ "زمانہ کا ارتقائی تصور"[1] "عینیت وجود و وجوب خلق"[2] یا "انکار زمان و مکان کی صوفیانہ توضیح"[3] کیونکہ اس مزعومہ موضوع سے پیشتر انھوں نے یہی تین مسئلے بیان کیے ہیں۔

لیکن یہ شاید نیاز صاحب کو خود بھی معلوم نہ ہو، کیونکہ یہ ساری بحث جیسا کہ اعتذار میں اشارہ کیا جا چکا ہے "فکر اقبال" سے ماخوذ ہے۔ مگر انھوں نے جس مصلحت سے بھی ہو، اس کا ادنیٰ اشارہ کرنے کی بھی زحمت نہیں فرمائی۔ بلکہ اس کو چھپانے کے لیے خود اس فلسفیانہ بحث کو جو ایک ماہر فلسفہ کے قلم سے نکلی تھی، مسخ کر دیا۔

بہر حال خلیفہ عبد الحکیم مرحوم نے "فکر اقبال" (ص ۴۷،۴۸) میں لکھا تھا:۔

"علامہ نے اپنے بعض علم دوست احباب سے بیان کیا کہ برگسان کا مطالعہ کرنے سے قبل میں حقیقت زمان کے متعلق آزادانہ طور پر یہ تصور قائم کر چکا تھا اور انگلستان میں اپنی طالب علمی کے زمانہ میں میں نے اس پر ایک مختصر مضمون بھی لکھا جس کو میرے پروفیسر نے کچھ قابل اعتنا نہ سمجھا کیونکہ بات بہت انوکھی تھی، برگسان کے زور فکر اور قوت استدلال نے اس میں بہت وسعت اور گہرائی پیدا کر دی"۔

مگر ہمیں خلیفہ صاحب مرحوم کی یہ روایت ماننے میں تامل ہے، کیونکہ

(الف) یہ بات نہ تو علامہ نے خود خلیفہ صاحب سے براہ راست کہی تھی کہ ان کی ذمہ دارانہ شخصیت

---

[1] جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے: "زمانہ انگے (اقبال کے) یہاں رات دن کا نام نہیں تھا، بلکہ اسکا تعلق ارتقاء سے تھا،

[2] جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے: "زمانہ ...... کا تعلق ... اس عینیت سے تھا جس میں وجود اور وجوب خلق کا فرق و امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا"۔

[3] جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے: "اور جس کو صوفیا نے لب و لہجہ میں یوں ظاہر کیا ہے:۔

نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ"۔

پر اعتماد کر کے اسے تسلیم کر لیا جائے، اور

(ب) نہ انھوں نے ان "بعض علم دوست" احباب کے نام بتائے جن کی وساطت سے یہ بات انھیں معلوم ہوئی کہ ان احباب کی "ذمہ داری" کی تحقیق کر کے اسے تسلیم کر لیا جاتا۔

اس تفصیل کی عدم موجودگی میں اس روایت کی حیثیت چند خوش دل دوستوں کی خوش وقت گذرانی سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی، بالخصوص جب کہ قرائن اس کے خلاف ہیں:

(الف) علامہ اقبال کے مکاتیب کے مختلف مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اگر انھوں نے قیام انگلستان کے دوران میں اس موضوع پر کچھ لکھا ہوتا، یا لکھنے کا ارادہ کیا ہوتا، یا سوچا ہی ہوتا، تو کسی نہ کسی مکتوب میں اس کا حوالہ آ جانا چاہیے تھا، چنانچہ جب انھوں نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں اس مسئلہ پر سوچا اور لکھا تو اس کی تحقیق سید سلیمان ندویؒ ہی سے کی تھی۔

نیز سید صاحب کے ساتھ ان کی جو مکاتبت ہوئی ہے، اس میں فطری طور پر اس بات کے مواقع تھے کہ اگر علامہ نے کبھی اس سے پہلے اس موضوع پر سوچا یا لکھا ہوتا، تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتے۔

(ب) خوش قسمتی سے سید عبد القادر صاحب نے بانگ درا میں کلام اقبال کو متعین ادوار میں تقسیم کیا ہے، جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ انھوں نے دوران قیام انگلستان میں کون کون سی نظمیں لکھی تھیں، ان نظموں میں بہت سے فلسفیانہ خیالات ہیں، اگر نہیں ہے تو کوئی زمانہ سے متعلق۔ ظاہر ہے اگر علامہ نے اس عرصہ میں زمانہ کے متعلق کچھ سوچا ہوتا تو ضرور اس کی جھلک غیر شعوری طور پر ان کے اشعار میں آ جاتی۔

(ج) لیکن سب سے زیادہ شاہد صادق ان کا Development of Metaphy-sics in Persia ہے جو دوران قیام انگلستان میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس کتاب کو از اول تا آخر دیکھ جایئے، کہیں مسئلۂ زمان کی بحث نہیں ملے گی۔ حالانکہ جن مفکرین کے نظری

نظاموں کو علامہ نے اس میں قلمبند کیا ہے، ان میں کوئی ایسا نہیں تھا جس نے مسئلہ زمان پر نہ لکھا ہو، بلکہ ان میں وہ اساطین بھی تھے جو اسلام کی فکری تاریخ کے اندر، تصورِ زمان کی توضیح کے مسئلہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں:۔ مثلاً متکلمین بالخصوص امام غزالی اور امام رازی جنھوں نے فلاسفہ کے قول بالزمان کے پرخچے اڑا دیے: امام غزالی نے "تہافت الفلاسفہ" میں اور امام رازی نے "المحصل" میں [جہاں انھوں نے انکار زمان کی تائید میں پانچ دلیلیں دی ہیں، جن کی وجہ سے وہ بعد کے فلاسفہ میں معتوب و منضوب ٹھہرے]۔ فلاسفہ میں ابن سینا نے زمانہ کے تصور کو سائنٹفک بنیادوں پر استوار کیا، ابن رشد نے "تہافت الفلاسفہ" کے ضمن میں امام غزالی کے مسلک متعلق "نفی زمان" پر تعقب کیا، ابوالبرکات بغدادی نے زمانہ کا ایک نیا تصور پیش کیا، محقق طوسی نے امام رازی کے تعقباب پر گرفت کی، محقق دوانی نے فلاسفہ کے مسلک متعلق زمان کی تعدیل کی، میر باقر داماد نے امام رازی کو سب و شتم کرنے کے علاوہ تعمیری طور پر "حدوث دہری" کا نظریہ وضع کر کے فلاسفہ کے قریب الانہدام موقف پر پشتہ لگانے کی کوشش کی، علامہ اقبال نے ان میں سے اکثر مفکرین کے فکری نظاموں کے ساتھ "فلسفہ عجم" میں اعتناء کیا ہے، مگر تعرض نہیں کیا تو فلسفہ "زمان" کے مسئلہ سے۔

اگر علامہ نے دوران قیام انگلستان میں کبھی اس مسئلہ پر سوچا ہوتا تو شعوری یا غیر شعوری طور پر "فلسفہ عجم" میں فلاسفۂ اسلام کے مواقف متعلقہ "زمان" سے ضرور تعرض کرتے، اس باب میں ان کی خاموشی اس بات کی دلیل قاطع ہے کہ انھوں نے اس زمانہ میں "مسئلہ زمان" کے موضوع پر کچھ لکھنا تو درکنار، سوچا بھی نہیں تھا،

(د) پھر خلیفہ صاحب مرحوم نے جس انداز میں یہ روایت فرمائی ہے، قرائن اس کی تردید کرتے ہیں، مگر بذات خود اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ناقابل یقین ہو۔ اس کے برخلاف نیاز صاحب نے اس "مال غنیمت" کو مسخ کر کے فی نفسہ ناقابل یقین بنا دیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

(۱) اقبال نے زمانۂ قیام یورپ میں اس موضوع پر ایک مختصر سا مضمون لکھا۔

[اقبال کا قیام یورپ کا زمانہ ۱۹۰۵ء۔ ۱۹۰۸ء ہے]

(۲) بعد کو جب برگسان نے اس موضوع پر اپنے پرزور دلائل پیش کیے تو اہل نظر چونک پڑے

[برگسان نے زمانہ کے اس نئے تصور "دوران خالص" کو اپنی کتاب "زمانہ و ارادہ مختار" میں بیان کیا ہے اور یہ کتاب ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی تھی]

یعنی پہلے ۱۹۰۸ء آیا، اس کے بعد ۱۸۸۹ء

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

قرائن کے علاوہ فکری دواعی بھی اس کے مقتضی تھے کہ "دوران خالص" کا تصور پہلے برگسان کے ذہن میں آیا (۱۸۸۹ء) اور اگلی صدی میں اقبال نے اس سے اخذ کیا (۱۹۱۰ء کے بعد) اور پہلی مرتبہ انھوں نے اسے "اسرار خودی" (۱۳-۱۹۱۵ء) میں پیش کیا۔ مزید تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(الف) برگسان انیسویں صدی کے نصف آخر میں ۱۸۵۹ء کے اندر جس سال کہ ڈارون کی "اصل الانواع" شائع ہوئی تھی، پیدا ہوا تھا، گویا قدرت نے زہر کے ساتھ تریاق بھی پیدا کر دیا۔ کیونکہ مادہ پرستانہ نظریۂ ارتقا کے تابوت میں آخری کیل برگسان کے تخلیقی ارتقا ہی نے ٹھونکی ہے۔ برگسان کو بچپن ہی سے تین مضمونوں سے دلچسپی تھی: ریاضی، حیاتیات اور کلاسیکی بالخصوص یونانی ادب سے۔ ریاضیاتی میلان کا نتیجہ تھا کہ وہ تیس سال کی عمر میں "زمانہ اور ارادہ مختار" جیسی مہتم بالشان تصنیف مرتب کر سکا، جو بجا طور پر فلسفہ کی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی ہے، حیاتیات کے شوق فراواں کا نتیجہ تھا کہ اس نے مادہ پرستانہ "نظریۂ ارتقاء" کا متبادل بلکہ حریفانہ نظریہ "تخلیقی ارتقاء" کے عنوان سے پیش کیا۔ کلاسیکی ادب (یونانی ادبیات) کے مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ وہ ماہر حیاتیات

سائنس داں بننے کے بجائے، فرانس کا عظیم فلسفی قرار پایا۔

لیکن جب تک وہ اسکول میں رہا، تینوں مضامین ریاضی، علوم طبیعیہ اور یونانی ادب میں یکساں طور پر ممتاز رہا اور ہر موقعہ پر انعام وہی حاصل کرتا۔ یہاں تک کہ "بکالوریا" کا درجہ پاس کر لینے کے بعد وہ آسانی سے یہ طے نہ کر سکا کہ آیندہ تعلیم اسے آرٹ میں جاری رکھنا چاہیے یا سائنس میں، کیونکہ جس طرح ریاضی اور سائنس میں اس کی صلاحیتیں غیر معمولی تھیں، یونانی ادب میں بھی ... دستگاہ عالی رکھتا تھا، اور اسی لیے آخر کار اس نے (Ecole normale superieure) کے اندر ۱۸۷۸ء میں ... یونانی ادب ہی میں داخلہ لیا، اور زمانہ طالب علمی ہی میں "ماہر یونانیات" کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ یونانی ادب کا پروفیسر ٹرنیز (Tournier) اپنے ان شاگردوں کا ایک رجسٹر رکھا کرتا تھا جنھوں نے یونانی ادب کے مسخ شدہ نسخوں کی تصحیح و ترتیب کا کام اپنے ذمہ لے لیا تھا، جب تک برگسان اس کالج میں طالب علم رہا، یہ شرف اس کے سوا کسی اور کو نہ مل سکا اور صرف اسی کا نام اس رجسٹر پر ثبت رہا۔

اس سے یونانی ادب میں اس کے تبحر کا اور "یونانیات" سے اس کی غیر معمولی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہاں کا تین سال کا کورس مکمل کرنے کے بعد برگسان نے Licence - Lettres کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد وہ Angres کے اسکول میں ملازم ہو گیا، اسکول کے فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد جو وقت بچتا اس میں اس نے مشہور یونانی حکیم لکریٹس کے منظوم فلسفہ طبیعیات کو "Extrait de Lucrece avec commentaire" ^notes کے عنوان سے اڈٹ کیا۔ یہ اس کی یونانی ادب اور فلسفہ سے رغبت کا دوسرا ثبوت ہے۔

Angres میں دو سال قیام کے بعد وہ Clermont-ferrand میں پروفیسری کے عہدہ پر مقرر ہوا۔ یہاں اس نے ڈاکٹریٹ کی سند کے لیے دو مقالے مرتب کیے: پہلا

فلسفۂ ارسطو سے متعلق، دوسرا اس کا شاہ کار "زمانہ و ارادہ مختار" تھا۔

قیام کلیرمون کا سب سے اہم واقعہ [جو تاریخ فکر انسانی کے اہم ترین واقعات میں سے ہے] "دوران خالص" کی اہم دریافت [یا "بازدریافت"] ہے۔ اس کے ایک سوانح نگار کا کہنا ہے کہ ایک دن وہ کلاس میں ایلیائی حکیم زینو کے مشہور معمے Paradox پر لیکچر دے کر آیا تھا کہ زینو کا یہ قول محال حرکت کے وجود حقیقی کے خلاف سب سے زبردست حجت ہے اور اکثر مفکرین روزگار نے اسکو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ برگسان کا دماغ بھی اس دن اسی قول بالمحال کے حل کرنے میں مصروف تھا، چنانچہ جب وہ حسب معمول چہل قدمی کے لیے نکلا تو اس نے ایسا محسوس کیا کہ یکایک اس کے ذہن میں "دوران خالص" کے تصور کا القا ہوا ہے۔

[حالانکہ یہ دمسقیوس نو فلاطونی کی "سرمدیت ثابتہ" کے غیر شعوری تذکر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔]

بہر حال کلیرمون کے بعد وہ پہلے ۱۸۹۸ء میں Ecole Normale میں اور دو سال بعد کالج دی فرانس میں پروفیسر منتخب کیا گیا، پہلے یونانی فلسفہ کا اور بعد میں فلسفۂ جدید کا۔

لیکن ابھی اسے عالمگیر شہرت نصیب نہیں ہوئی تھی، صرف فرانس ہی میں لوگ اسے جانتے اور اس کے فلسفہ کا مطالعہ کرتے تھے، جب ۱۹۰۷ء میں اس کی "تخلیقی ارتقا" شائع ہوئی اس وقت دنیا نے جانا کہ فرانس نے فکری افق پر فلسفہ کا ایک عظیم درخشاں ستارہ طلوع ہوا ہے، یورپ اور امریکہ کے مفکرین نے اس کے افکار و تصورات کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ شروع کیا، اور دو تین سال کے عرصہ میں اس کی تصانیف دنیا کی مشہور زبانوں میں ترجمہ ہونے لگیں۔ ان میں سب سے پہلے "Essia sur les donnees immediates de le Concience" کا انگریزی ترجمہ ایف۔ ایل۔ پوگسن نے "Time and Free will" کے عنوان سے کیا۔

جس کا مرکزی خیال "دوران خالص" کا نظریہ ہے۔

یہ "دوران خالص" کا نظریہ جسے برگسان کے شارح اور سوانح نویس اس کے ذاتی فکر کا نتیجہ بتاتے ہیں، در اصل نو فلاطونی فلاسفہ بالخصوص دمسقیوس کی فکر زمانی کی صدائے بازگشت تھا، اس خیال کی تائید برگسان کی زندگی کے مندرجۂ ذیل واقعات سے ہوتی ہے:۔

۱۔ برگسان بچپن ہی سے یونانی زبان و ادب کا شیدائی تھا۔

۲۔ بکالوریا کا درجہ پاس کرنے کے بعد اس نے کالج میں یونانی ادب ہی کو خصوصی مضمون کی حیثیت سے منتخب کیا۔

۳۔ یہاں پروفیسر ٹورنیز (Tournier) کے ان شاگردوں میں جو یونانی ادب کے شاہکاروں کی تصحیح و ترتیب میں ید طولیٰ رکھتے تھے، برگسان کو یہ غیر معمولی امتیاز حاصل ہوا کہ اس کے مقابلے میں پروفیسر مذکور نے اپنے رجسٹر میں کسی اور کا نام تک درج نہیں کیا۔

۴۔ Angres میں اس نے حکیم لوکریٹس کی فلسفیانہ نظم سے دلچسپی لی اور اسے ایڈٹ کیا۔

۵۔ کلیرمون میں اس نے نفسیات کے جو دو مقالے مرتب کیے، ان میں ایک فلسفۂ ارسطو پر تھا، اور دوسرے کا مرکزی خیال "نو فلاطونی فلسفی دمسقیوس کی فکر زمانی کی تحقیق" پر مبنی تھا، اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

۶۔ اور آخر میں وہ "یونانی فلسفہ کی کرسی" پر مامور کیا گیا۔

یہ تمام واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ یونانی فلسفہ پر برگسان کی بڑی گہری نظر تھی، جس طرح دور اول کے یونانی "اہل الطبائع" کے فلسفیانہ افکار پر نظر رکھتا تھا [مثلاً ایلیائی حکما، بالخصوص زینو نے حرکت کے خلاف جو دلائل چہارگانہ دیے ہیں، برگسان ان سے بخوبی واقف تھا] اسی طرح وہ یقیناً دور آخر کے نو فلاطونی حکماء کی کاوشوں سے بھی واقف تھا، اور ان کے تفکیری مواقف کا

گہرا مطالعہ کر چکا تھا۔

یونانی فلسفہ کے اس دم واپسیں (دور نو فلاطونیت) کا آخری نمایندہ حکیم دمسقیوس تھا، جسے اس کے ساتھیوں سمیت قیصر جسٹینیان نے ۵۲۹ء میں ایتھنز کے مدرسہ فلسفہ کی قفل بندی کے بعد جلاوطن کر دیا تھا، دمسقیوس ایران پہنچا، یہاں خسرو نوشیرواں نے اس کا خیر مقدم کیا اور بڑے عزت و احترام سے دو سال اپنے یہاں رکھا، اس عرصہ میں دمسقیوس کو ایرانی حکما، و مفکرین سے ملنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع ملا، اور ان کے آراء و افکار سے متاثر ہوا، یوں بھی نو فلاطونیت مشرقی افکار سے پہلے ہی بہت کچھ اثر قبول کر چکی تھی۔

اس وقت ایران میں دوسری بدعتی تحریکوں کے ساتھ "زروانیت" بھی از سر نو ابھر رہی تھی، اس نے رائج الوقت "مزدائیت" (مروجہ مجوسیت) کے اہورا مزدا اور اہرمن کی ثنویت کی اصل "زروان" کی وحدت کو قرار دیا، اس طرح اس عہد کے ایران میں زمانہ کے دو تصور تھے:۔ ایک "زروان اکنارگ" (زمان ابدی لامحدود) اور دوسرا "زروان دیرنگ خداثے" (زمان طویل التسلط) زمانہ کے ان تصورات نے دمسقیوس کی فکر زمانی کو بھی متاثر کیا، چنانچہ اس نے اس نئی تحقیق سے فائدہ اٹھا کر بقول اوڈھم زمانہ کے تین مفہوم مقرر کیے: "سرمدیت ثابتہ" "زمان سائل (جاری جو بالاستمرار تغیر متصل میں رہتا ہے) اور ایک تیسرا مفہوم جو "ان دونوں مفہوموں کے بین بین ہے۔

[تصور زمان کی یہ تدقیق جو کبھی دو شکلیں اختیار کرتی ہے اور کبھی تین، یونانی فلاسفہ سے حکمائے اسلام میں بھی منتقل ہوئی، چنانچہ ابو سلیمان سجستانی نے اسے "دہر مطلق" اور "دہر بالاضافہ" میں تقسیم کیا تھا اور شیخ بو علی سینا نے "سرمد" "دہر" اور "زمان" میں]

بہرحال برگسان دمسقیوس کی فکر زمانی سے اچھی طرح واقف تھا، اور اس کا ذہن "معمائے زینو" کے سلجھانے میں بے طرح مصروف تھا، اس لیے تصور زمان کے ان دو مفہوموں سے تحت الشعور میں

پڑی ہوئی دمسقیوس اور اس کے پیشرووں کی تدقیق کے "باز تذکر" کو اس نے ایک "القائے غیبی" اور "وجدان" سمجھا، اور محسوس کیا کہ اسے معمائے زینو کے سلجھانے کا اطمینان بخش "انکشاف" ہوگیا ہے۔ حالانکہ یہ مزعومہ "انکشاف" دمسقیوس کی تدقیق کے تذکر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

مگر برگسان کے عقیدت مند شراح وسوانح نگار "دوران خالص" کی دریافت کو [جو دمسقیوس وغیرہ کی سرمدیت ثابتہ کی ایک دوسری شکل ہے] برگسان ہی کی جدتِ فکر کا نتیجہ سمجھتے ہیں، چنانچہ اس کا سوانح نگار الگوٹ رُجی (Agot Ruin) لکھتا ہے:۔

"یہ کلیرمون ہی کا واقعہ ہے کہ ایک دن جب برگسان ان تضادات (ایرادات و اعتراضات) پر لکچر دے کر آیا تھا جو ایلیائی حکما نے حرکت کے وجود پر وارد کیے ہیں اور حسب معمول چہل قدمی کیلئے نکلا تھا کہ اس کے ذہن میں "دوران خالص" کا انکشاف ہوا، جو اس کے نظام فکر کا کلیدی تصور ہے۔"[1]

حالانکہ جسے یہ لوگ "Inspiration" سمجھتے ہیں، صرف "لاشعور" میں پڑے ہوئے ایک خیال کا فوری تذکر تھا۔ فلسفی (برگسان) کا ذہن مختلف انداز سے زینو کے "قول بالمحال" کو حل کرنے میں مصروف تھا کہ دمسقیوس وغیرہ کی سرمدیت ثابتہ" کی یکایک یاد آگئی اور اس نے ایک حد تک اس معما کو حل کردیا۔ یہ تذکر اور نو فلاطونی تفکیر سے استفادہ [جس کی تفصیلی کیفیت کا وہ کسی فوری ذہنی جھٹکے کے تحت ادراک نہ کرسکا]

---

1 "It was at Clermont - Ferrand that Bergson ....one day, when taking regular walk after he had lectured on the antinomies in regard to movement, of Eleatic school, an inspiration came to him, bringing the master idea of his whole doctrine — the idea of duration."

ایک واقعی حقیقت ہے، چنانچہ ولیم رالف انگے جس نے فلاطینوس اور اس کے فلسفہ پر لکچر دیئے تھے، لکھتا ہے:۔

"بیرن فان ہیوگل اس خوش آیند عقیدے کی طرف مائل ہے کہ دہر کے تصور میں برگسان کے دوران خالص کا جرثومہ مضمر ہے۔"[1]

جرمن فلسفی انگے فان ہیوگل کے متعلق لکھتا ہے کہ انھیں شدید مماثلتوں کی بنا پر اس کا خیال تھا کہ برگسان کی یہ دریافت یعنی "دوران خالص" فلاطینوس کے تصور "سرمد" سے ماخوذ ہے، خود فان ہیوگل لکھتا ہے کہ ہر چند "زمان" دائمی ہو، پھر بھی اس میں ابتدا اور انتہا کو فرض کیا جاسکتا ہے۔ اسکے برعکس "سرمد" ایک "معیت کلیہ" (Tota simul) ہے۔ لیکن "دہر" (Aeviem) دونوں کے بین بین ہے۔ البتہ اس پر ان کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے:۔

"ہمیں یہاں اس چیز کا ایک دلچسپ گرو دھندلا سا تصور ملتا ہے جسے برگسان دوران خالص سے تعبیر کرتا ہے، یعنی ایسا تعاقب و تداول جس میں کبھی تغیر نہیں ہوتا، کیونکہ اس کے اجزائے ترکیبی مختلف انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔"[2]

---

1 Baron Von Hugel has yeilded to the temptation to find in the notion of aeviem an anticipation of Bergson's duree". (William Ralph Inge: Philosophy of Platinus, Vol II, P 100)

2 We have here an interesting groping after what M. Bergson now describes under the designation of duree, the successon which is never all change, since its constituents, in varying degrees, overlap and interpene-trate each other." (Baron Friedrich Von Hugel: Eternal Life. P 106)

(ب) لیکن برگسان نے اس "نئے انکشاف" یا "بازدریافت" کو محض ابعد الطبیعیاتی قیاس آرائیوں کا کھلونا ہی نہیں بنایا۔ زینو کے قول بالمحال کو حل کرنے کے علاوہ اس نے اسے ایک مفید تر مصرف میں استعمال کیا۔ یہ مصرف "فلسفۂ اختیار" کو مستحکم اور پائدار منطقی بنیادوں پر استوار کرنا تھا، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

پچھلی صدی میں اگر مشرق "مقدر پرستی" کے داہمہ میں مبتلا تھا، تو مغرب سائنس کی تا بحد ثریا پہنچی ہوئی ترقی کے باوجود "میکانکی جبر و لزوم" میں گرفتار تھا، کائنات ایک بندھے ٹکے نظام کا نام تھا جو علت و معلول کے ناقابل شکست سلسلہ میں جکڑا ہوا تھا، "طبیعیاتی علوم" اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ وہ دیے ہوئے "معطیات سائنس" سے مستقبل کی پیشین گوئی کر سکتے تھے، لیکن ڈارون کی "اصل الانواع" کی اشاعت کے ساتھ یہ خوش فہمی "حیاتیاتی" اور اس کے بعد "نفسیاتی" علوم میں بھی سرایت کر گئی، اس کا نتیجہ ایک شدید قسم کے "جبر و لزوم" کی شکل میں نکلا، جہاں "آزادی انتخاب" اور "حریت عمل" بے معنی لفظ تھے۔

ابتداءً یہ "معطیات سائنس" تین تھے: مکان، زمان اور مادہ۔ بعد میں مکان کے ابعاد ثلثہ اور زمان کے بعد واحد کو مجموعی طور پر ایک "مکانی۔ زمانی" "حقیقت واحدہ کے" "ابعاد اربعہ" میں بدل دیا گیا جس کے اندر مادہ کی انفرادیت بھی گم ہو کر رہ گئی، اور تمام مظاہر کائنات اور حوادث روزگار کی توجیہ کا ضامن اسی "مکانی۔ زمانی" "حقیقت" کو سمجھ لیا گیا، جس کے دائرۂ اقتدار میں "غیر نامی کائنات" کے علاوہ "نفسیاتی کائنات" بھی پابند تھی۔

اس اندازِ فکر نے حریتِ عمل اور ارادہ مختار کو حرف غلط بنا دیا۔ مگر ایک صحت مند معاشرہ کے لیے یہ بڑی ناپسندیدہ صورت حال تھی۔ اس لیے سنجیدہ مفکرین نے اس کی اصلاح کی کوشش کی۔ ان میں دو نام نمایاں ہیں: کانٹ اور برگسان۔ کانٹ نے "اختیار" کو "اشیاء بالنفسہا" کے حریم مقدس میں

میں لیجا کر بٹھایا، جس کے متعلق برگسان کہتا ہے کہ "اس کے پراسرار آستانہ تک تمھارے شعور کی رسائی نہیں ہو سکتی"۔

خود برگسان نے اس گتھی کو "دوران خالص" کے ذریعہ [جس کا اس پر کلیر مون میں انکشاف ہوا تھا] سلجھایا اور Essai Sur less donness immedia tes de la conci-ence ایک کتاب لکھی [جس کا بعد میں انگریزی میں "Time and Free will" کے عنوان سے ترجمہ ہوا] اس کے مقدمہ میں کہتا ہے:-

"جو مسئلہ میں نے بحث و تمحیص کے لیے منتخب کیا ہے وہ ...... ارادہ مختار کا مسئلہ ہے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ میں ثابت کرنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ قائلین جبر و لزوم اور ان کے مخالفین کے مابین جو بحث و نزاع ہے، اس کے اندر مدت و امتداد، تعاقب و تداول اور ہم وقتی نیز کمیت و کیفیت کے درمیان ایک اندرونی خلط مبحث مضمر ہے۔ اگر ایک مرتبہ یہ خلط مبحث رفع ہو جائے تو غالباً ہم دیکھ لیں گے کہ وہ تمام اعتراضات بھی غائب ہو جاتے ہیں جو ارادہ مختار، اس کی حدود و تعریفات نیز خود مسئلہ جبر و اختیار کے خلاف وارد کیے جاتے ہیں۔ پیش نظر کتاب کے تیسرے حصہ کا مقصد اسی بات کو ثابت کرنا ہے"۔

اسی طرح جب اس پر فرانس کے مذہبی حلقوں کی طرف سے مادہ پرستی کا الزام لگایا گیا تو اس نے اپنی تصانیف ہی کی مدد سے اپنی "مذہبیت" کا ثبوت دیا اور لکھا:-

"میرے مقالے شعور کے قریبی معطیات (زمانہ و ارادہ مختار) میں جو ملحوظات پیش کیے گئے ہیں، ان کا مقصد مسئلہ اختیار کی حقیقت کو واضح کرنا ہے"۔

برگسان نے یہ کتاب [زمانہ و ارادہ مختار] ۱۸۸۹ء میں لکھی تھی[۱]۔ مگر اس کو اور اس کی دوسری

۱؎ اسیلیے نیاز صاحب کی یہ گلفشانی انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ "اقبال کے بعد برگسان نے اس موضوع پر اپنے پرزور دلائل پیش کیے"۔ (اقبال کے متعلق ۱۹۰۵-۱۹۰۸ء) کے دوران میں اس مسئلہ پر مختصر مضمون لکھنے کا دعوی کیا جاتا ہے۔ اور برگسان بیس سال پہلے اس مسئلہ کو تفصیلی طور سے لکھ کر شائع بھی کر چکا تھا۔

تصانیف کو عالی شہرت ۱۹۰۷ء کے بعد ہوئی جبکہ اس کی "تخلیقی ارتقا" نے منظر عام پر آکر فکری دنیا میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی اور ۱۹۱۰ء میں ایف، ایل۔ پوگسن نے اس کی کتاب "شعور کے قریبی معطیات" کا "زمانہ و ارادہ مختار" کے نام سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔

(ج) یہ ترجمہ علامہ اقبال کی نظر سے بھی گذرا۔ چونکہ اس کا مرکزی خیال "آزادی انتخاب" اور "ارادہ مختار" کا اثبات تھا، اور علامہ بھی اس کی تلاش میں تھے۔ اس لیے انھوں نے اس فلسفہ عمل کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اس سے پورا استفادہ کیا۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

اقبال کے قیام یورپ (۱۹۰۵ء - ۱۹۰۸ء) کے دوران میں ان میں ایک عظیم انقلاب آیا، انھوں نے شاعر فطرت کے بجائے "ملی شاعر" بننے کو ترجیح دی، خلیفہ عبد الحکیم "فکر اقبال" میں لکھتے ہیں:۔

"یورپ میں کہی ہوئی اقبال کی نظمیں بہت کم ہیں، لیکن انھیں میں سے بعض میں ان کی شاعری کے موضوع کا رخ بدلتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ اس تمنا نے ان کو بے تاب کرنا شروع کیا ہے کہ اپنی پس ماندہ اور افتادہ ملت کو بیدار اور ہوشیار کیا جائے۔۔۔۔۔

۔۔۔ قوم میں خودی اور خودداری کا احساس پیدا کیا جائے، احساس کمتری کو مٹا کر اس میں خودی کے جذبے کو ابھارا جائے۔" (فکر اقبال ص ۹۵)

علامہ نے دیکھا کہ دوسری پس ماندہ اقوام کی طرح ان کی قوم میں بھی جذبۂ عمل کوشی اور بلند حوصلگی کا فقدان ہے، اس لیے انھوں نے اس کی خودی کو ابھارنے کے لیے اپنی شاعری اور فلسفہ کو وقف کر دیا۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے — خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں — تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

لیکن انھوں نے صرف اس رجز بلیغ ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے پیغام عمل کی بنیاد ایک مستحکم اساس پر قائم کرنا چاہی۔ مسئلہ جبر و اختیار کی جو حقیقت بھی ہو، قومیں اپنے دور عروج میں عملاً

"اختیار" کی اور عہد زوال میں "جبر" کی قائل ہوا کرتی ہیں۔ ان کی بلند حوصلگی اور شکست ہمتی علم کلام کی موشگافیوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ اموی مظالم کے عہد میں امام حسن بصریؒ کی "قدریت" اور یورش تاتار کے زمانہ میں مولانا روم کی "حریت و اختیار" کی ترجمانی، اجتماعیات کے اسی قانون کا نتیجہ تھیں، اس لیے مولانا روم نے چھ سو سال پہلے جو کام شاعری سے لیا تھا، عہد حاضر میں علامہ اقبال نے اپنے فلسفہ سے لیا اور اپنے پیغام عمل کی بنیاد "حریت عمل" اور "ارادہ مختار" کی اساس پر رکھی۔

اس اساس کے لیے اقبال نے برگساں سے خصوصی طور پر استفادہ کیا، چنانچہ "خطبات" (ص ۶۲) میں فرماتے ہیں:۔

"معاصر فکر کے نمائندوں میں برگساں اس بات میں منفرد ہے کہ اس نے زمانہ کے باب میں دوران خالص کا بڑا عمیق مطالعہ کیا ہے۔"

پروفیسر ایم ایم شریف لکھتے ہیں:۔

"اقبال بھی دوران خالص اور تسلسلی زمان کے درمیان اسی طرح فرق کرتے ہیں جس طرح برگساں نے کیا ہے اور وجوہ بھی یکساں ہیں۔"[۱]

اسی طرح رسالہ "اقبال" (لاہور) کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بشیر احمد ڈار اپنے مقالہ "اقبال اور برگساں" میں لکھتے ہیں:۔

"زمان کے بارے میں اقبال کا تصور بہ تمام و کمال برگساں ہی سے ماخوذ ہے، اور اختیار کے مسئلہ پر یہ تینوں (مولانا روم، برگساں اور اقبال) ہم نوا ہیں۔"[۲]

اس طرح علامہ نے سب سے پہلے اس مسئلہ کو "اسرار خودی" میں پیش کیا، جسے غالباً ۱۹۱۳ء سے

---

[۱] اقبال لاہور (اپریل ۱۹۶۰ء) ص ۱۵
[۲] فلسفۂ اقبال صفحہ ۱۱۵

لکھنا شروع کیا تھا،ٰ چونکہ ابھی برگسان کا اثر تازہ تھا، اس لیے وہ اسی کی طرح "دوران خالص" اور "پیمائشی زمان" (یا تسلسلی زمان) میں امتیاز کرتے ہیں اور جس طرح برگسان "پیمائشی" زمان کو "عقلی" اور مکان کا "وہمی ظل" سمجھتا تھا، اقبال بھی اسے "خطی" اور کافرانہ انداز فکر قرار دیتے ہیں :۔

اے اسیر دوش و فردا در نگر — در دلِ خود عالم دیگر نگر

در گل خود تخم ظلمت کاشتی — وقت را مثل خطے پنداشتی

باز با پیمانۂ لیل و نہار — فکر تو پیمود طول روزگار

ساختی ایں رشتہ بزنار دوش — گشتۂ مثلِ بتاں باطل فروش

بعد میں انھوں نے اسپنگلر اور الیگزنڈر کے اثر سے [اور غالباً ایرانی زروانیت کے مطالعہ کے نتیجے میں] اس میں بڑے اغراق و غلو سے کام لیا، جس کی تفصیل کا یہاں مقام نہیں ہے۔

بہر حال زمانہ کا یہ نیا تصور بلکہ خود مسئلہ زمان کے ساتھ اقبال کا اعتنا، برگسان کی تقلید اور اس سے اثر پذیری کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ

"اقبال نے زمانۂ قیام یورپ میں اس موضوع پر ایک مختصر سا مضمون لکھا"

کسی تبصرے کا محتاج نہیں ہے۔

(۹) نیاز صاحب لکھتے ہیں :۔

"ایک دن اقبال و برگسان کے درمیان اس مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی کہ اقبال نے کہا کہ مسئلہ زمان اس وقت بہت دقیق و نازک سمجھا جاتا ہے لیکن مسلمانوں کے لیے اس میں کوئی زیادہ الجھن کی بات نہیں ہے کیونکہ اسلام نے اس کو جس طرح حل کر دیا ہے وہ فلسفہ کی آخری حد سے زیادہ بلند ہے"

ا؎ منشی سراج الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"یہ مثنوی گذشتہ دو سال کے عرصہ میں لکھی گئی مگر اس طرح کہ کئی کئی ماہ کے وقفوں کے بعد طبیعت مائل ہوتی رہی، چند اوقات کے دنوں اور بعض بیخواب راتوں کا نتیجہ ہے" (اقبال نامہ ص ۲۳ بحوالہ اقبال کامل از مولانا عبدالسلام ندوی)

لیکن یہ نیاز صاحب کی اپنی دریافت نہیں ہے، بلکہ "ذکر اقبال" سے اڑایا ہوا مال غنیمت ہے، (جس کا انھوں نے حوالہ تک نہیں دیا) بہر حال خلیفہ عبدالحکیم نے لکھا ہے :۔

"علامہ فرماتے تھے کہ گول میز کانفرنس کے سفر کے دوران میں برگسان سے میں ملا، تاکہ اپنے اس ہم فکر اور ہم طبع مفکر سے تبادلۂ خیالات کروں"۔

دوران ملاقات میں حقیقت زمان پر گفتگو ہوئی جو اقبال اور برگسان کا واحد مضمون تھا۔

اقبال کہتے ہیں کہ میں نے برگسان کو بتایا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دہر کے متعلق یہ فرمایا ہے

اقبال اور برگسان کی اسی ملاقات کے پس منظر میں مولانا عبدالشاہد خاں شروانی نے "باغی ہندوستان" میں لکھا ہے :۔

"علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم جب یورپ گئے اور وہاں انھیں لیکچر بھی دینا تھا تو جناب میر غلام بھیک نیرنگ کی معرفت مولانا معین الدین اجمیری) سے زمان یا دہر پر مضمون لکھایا تھا، اس کی انگریزی کر کے وہاں کی علمی مجلس میں وہ مضمون پڑھا، جو بیحد پسند کیا گیا۔ وہاں سے واپسی پر مولانا کو شکریہ کا خط لکھا تھا۔ مولانا نے ایک موقع پر وہ خط مجھے بھی دکھایا تھا۔ معلوم نہیں اب بھی کاغذات میں وہ محفوظ ہے یا نہیں"۔

لیکن علامہ نے جو کچھ علمی مجلس میں سنایا یا برگسان کو بتایا، وہ ان کی اپنی اختراع تھی۔ اسلامی فکر کی اس توضیح سے جو مولانا اجمیری نے انھیں لکھ کر بھیجی تھی، اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، کیونکہ وہ ذہنی سرمایہ جو ان دقیق مسائل کو ان کے صحیح پس منظر میں سمجھنے کے لیے درکار ہے، علامہ کے پاس بہت کم تھا اور جو کچھ تھا بھی، اسے برگسان، اسپنگلر، الیگزنڈر اور آخر میں ایرانی زروانیت کی تقلید نے مسخ کر دیا تھا۔ چاہے اسلامی تعلیمات ہوں، یا مفکرین اسلام کے افکار، علامہ سب کو ان ہی کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال اسلامی فکر اور اس کے مفکرین کے افکار کی حقیقت سے بڑی حد تک خالی الذہن تھے۔ ان کا کوئی واضح تصور ان کے ذہن میں نہیں تھا، مولانا اجمیری نے اپنی مختلف تصانیف میں زمانہ کی بحث کے سلسلے میں میرباقر داماد خصوصاً ان کے نظریۂ حدوثِ دہری کا ذکر کیا ہے اور اس پر بڑی بالغ النظری سے تبصرہ کیا ہے۔ مولانا نے علامہ کو جو "مضمون" لکھکر بھیجا تھا، اس میں بھی یہ چیزیں ہوں گی۔ اس تقریر کو علامہ نے یا اسے انگریزی میں منتقل کرنے والے مترجم نے کہاں تک سمجھا اسکا تو سوال ہی کیا؟ ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ اس تقریر میں مذکور افکار کے مفکرین کو بھی علامہ کماحقہ نہیں سمجھ پائے۔ چنانچہ انھوں نے "میرباقر داماد" کی واحد شخصیت کو دو مستقل شخصیتیں "ملا باقر" اور "میر داماد" بنا دیا۔ چنانچہ خطبات میں فرماتے ہیں:-

"This is what Mir Damad and Mulla Baqur mean when they say that time is born with the act of creation."

اس کے بعد اس خوش فہمی پر کہ علامہ نے برگسان کے سامنے اسلام یا مفکرین اسلام کی صحیح ترجمانی کی ہوگی، کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔"

حافظ ابن کثیرؒ

از جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

(۳)

عام خصوصیات کتب تفسیر کی عام خصوصیات اس میں بھی پائی جاتی ہیں، چنانچہ حسبِ موقع نحو، صرف، تجوید و اشتقاق، لغت و عربیت، فقہ و کلام، اختلافِ قرأت و اعراب، الفاظ کی لغوی تحقیق کے علاوہ ان کے مصادر، تثنیہ، جمع اور اصطلاحی مفہوم کی وضاحت، ترکیبی بحثیں، کلام عرب کے شواہد، اسالیب کلام اور معانی و بلاغت کے اسرار، شانِ نزول کا تذکرہ، انساب و اعلام قرآن کی تحقیق، مکی و مدنی سورتوں کی تعیین، ان کے فضائل، فقہی مسائل کی شرح و تحقیق اور مختلف مذاہب کے آراء و فتاوی اور روایات و آثار کا ذکر، ان کی تنقید اور مختار و مرجح مسلک کا ذکر اور پسندیدہ تفسیر کی نشاندہی سارے مباحث موجود ہیں۔

تفسیر ابن کثیر کے متعلق دو باتوں کی اور وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

تفسیر ابن جریر سے اس کی نسبت پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کو عام طور پر ابن جریر کی تفسیر کا خلاصہ اور تنقیح سمجھا جاتا ہے۔ مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم لکھتے ہیں:-

"امام ابن تیمیہ کے شاگرد رشید حافظ ابن کثیرؒ نے اسی (تفسیر ابن جریر) کا خلاصہ اور تنقیح کرکے اپنی تفسیر مرتب کی ہے۔" (مقدمہ معارف القرآن پرویز ج ۱ ص ۲۸)

اس خیال کو غلط تو نہیں کہا جا سکتا لیکن محتاج توضیح ضرور ہے۔

تفسیر ابن کثیر کے مقابلہ میں تفسیر ابن جریر کی اہمیت، اس کی قدامت، اولیت اور جامعیت کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے، ابن جریر نے جملہ تفسیری روایات و آثار کو اکٹھا کر دیا ہے، اور اس تفصیل و جامعیت کے لحاظ سے وہ اس عہد تک کی قرآنی انسائیکلوپیڈیا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ رطب و یابس ہر قسم کی روایات کا مجموعہ ہے، اس لیے ایسی جامع اور معلومات آفریں کتاب کی تلخیص و تنقیح بھی درحقیقت بڑا کارنامہ ہے اور اگر ابن کثیر کی یہ حیثت بھی تسلیم کرلیجائے تو یہ ایک بڑی مفید خدمت ہو،

اس میں جہاں صحیح و غلط روایتوں میں امتیاز کیا گیا ہے وہاں بہت سے مفید اضافے بھی ہیں اور ابن جریر کی تفسیر کے بعد جو مفید اور نئی تحقیقات سامنے آئیں ان کو بھی اس میں شامل کرلیا گیا ہے اس لحاظ سے اسکی اہمیت ابن جریر سے بھی زیادہ ہوگئی ہے، لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ تفسیر ابن کثیر میں ابن جریر کی تفسیر سے اور تفسیروں کے مقابلہ میں زیادہ استفادہ اور ان کے مختارات کو عموماً نقل کیا گیا ہے اور یہ ضروری بھی تھا، اس لیے کہ تفسیر ابن جریر کے رطب و یابس سے اگر قطع نظر کرلیا جائے تو اس سے زیادہ جامع کوئی تفسیر نہیں، اگرچہ ابن کثیر زیادہ تر ابن جریر کے مختارات کو نقل کرتے ہیں لیکن تحقیق و تنقیح کے بعد بعض مقامات میں انھوں نے ان سے اختلاف بھی کیا ہے، اور کہیں کہیں تو ان کے مختارات و مرویات پر تنقید کا لب و لہجہ سخت ہوگیا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

ابن جریرؒ کے نزدیک حمد و شکر کا ایک ہی مفہوم ہے، لیکن ابن کثیر کہتے ہیں کہ ان کا یہ دعوی محل نظر ہے۔ (ج ا ص ۲۲)

سورۂ اعراف کی ایک آیت ولقد جئناهم بكتاب فصلناه على علم کو ابن جریر نے کتاب انزل اليك فلا يكن في صدرك حرج پر عطف مانا ہے، لیکن ابن کثیر نے اس کو غلط بتایا ہے۔ اس لیے کہ دونوں آیتوں میں طویل فصل ہے۔ (ج ۲ ص ۲۲۰)

ابن کثیر سورۂ قصص کی آیت ما كان لهم الخيرة میں ماکو نافیہ مانتے ہیں اور ابن جریر نے الذی کے معنی میں۔

ابن جریر نے سورۂ واقعہ کی آیات ثلة من الاولين میں امم گذشتہ کو اور قليل من الآخرين سے اس امت کو مراد لیا ہے اور نبوت میں نحن الآخرون السابقون يوم القيامة (الحدیث) اور بعض اور روایتیں پیش کی ہیں، جن کی سندیں کمزور ہیں، حافظ ابن کثیر نے ان کے اس مرجح قول کی پرزور تردید کرکے ثابت کیا ہے کہ دونوں سے اسی امت کے لوگ مراد ہیں۔ (ج ۴ ص ۲۸۴)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن کثیرؒ نے ابن جریر کی تفسیر سے استفادہ ضرور کیا ہے، مگر اس کے پابند اور اندھے مقلد نہ تھے۔

تفسیر ابن کثیر کے منقولی ہونے کا مطلب

دوسری بات یہ ہے کہ تفسیر ابن کثیر کو عام طور پر ماثوری و منقولی تفسیر میں شمار کیا جاتا ہے، جو اس لحاظ سے صحیح ہے کہ اس میں احادیث و آثار کو نقل کیا گیا ہے، لیکن اس پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ عقلی دلائل بھی بیان کیے گئے ہیں، اور بحث و تحقیق اور تنقید و استدلال کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ اس تفسیر کی بنیاد نقل و روایت پر ہے، لیکن اس میں عقلی دلائل بھی ملتے ہیں، اور روایات کی صحت جانچنے میں انھوں نے تحقیق و تنقید اور نظر و استدلال سے کام لیا ہے، ذیل میں ان دونوں نوعیتوں کی مثالیں پیش کیجاتی ہیں :-

جن جاہلوں کا یہ خیال ہے کہ قرآن کی بعض چیزوں کی حیثیت محض تعبدی ہے، وہ شدید غلطی پر ہیں، یہ تو بہر حال متعین ہے کہ ان حروف (مقطعات) کے کوئی نہ کوئی معنی ضرور ہیں، خ[illegible]ان کو عبث نہیں نازل فرمایا ہے، ایسی صورت میں اگر انکے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات ثابت ہوگی تو ہم ان کو بیان کریں گے، اور حدیث سے نہ معلوم ہوگی تو توقف کریں گے اور یہ کہیں گے کہ [امنا به كل من عند ربنا]۔ حروف مقطعات کے متعلق علمائے امت کا کسی ایک قول اور مفہوم پر اجماع نہیں ہے بلکہ اختلافات ہیں، اس لیے اگر کسی دلیل سے کسی کے نزدیک کوئی مفہوم زیادہ واضح ہے تو اس کو اسے اختیار کرلینا چاہیے، ورنہ حقیقت حال کے انکشاف تک توقف کرنا چاہیے۔ (ج ا)

وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیھم (یوسف) کے سلسلے میں لکھتے ہیں

یعنی عورتوں کے بجائے اللہ تعالیٰ نے مردوں میں سے پیغمبر اور رسول بنا کر بھیجے۔ یہی جمہور علماء کی رائے ہے، جیسا کہ اس آیت کے سیاق سے ظاہر ہے، مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی سارہ اور موسیٰؑ کی ماں اور عیسیٰؑ کی ماں مریم بنت عمران بھی پیغمبر تھیں، اور ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت سارہؑ کو فرشتوں نے حضرت اسحٰقؑ اور ان کے بعد حضرت یعقوبؑ کی پیدائش کی بشارت دی تھی اور حضرت موسیٰ کی ماں کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ (واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیه) اور حضرت مریمؑ کے پاس فرشتہ حضرت مسیحؑ کی بشارت دینے آیا تھا، ان کے متعلق یہاں تک کہا گیا ہے کہ ان اللہ اصطفاکِ وطھرکِ واصطفاکِ علیٰ نساء العالمین یا مریم اقنتی واسجدی وارکعی مع الراکعین، مگر اس قدر و منزلت کے باوجود ان کو نبی نہیں کہا جا سکتا، اور اگر وحی سے ان کا شرف و مزیت مقصود ہو تو بلاشبہ یہ ان عورتوں کو حاصل تھا، مگر محض یہ چیز ان کو سلسلۂ نبوت میں شامل کرنے کے لیے کافی نہیں ہے اہل سنت والجماعت کا یہی خیال ہے، چنانچہ ابو الحسن اشعری نے لکھا ہے کہ وہ انبیاء نہیں، بلکہ صدیقات میں داخل ہیں، اور قرآن نے سب سے عالی مرتبہ عورت یعنی حضرت مریمؑ کے متعلق یہی کہا بھی ہے، ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبله الرسل وامه صدیقة کانا یاکلان الطعام) اس آیت میں ان کے سب سے اشرف و اعلیٰ مرتبہ یعنی صدیقیت کا ذکر ہے، نبی ہونے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اگر وہ نبی ہوتیں تو اس مقام پر جہاں ان کی شرف و عظمت کا ذکر ہو رہا تھا، اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہوتی، اس لیے نص قرآنی سے صرف ان کا صدیقہ ہونا ظاہر ہوتا ہے، (ج ۲ ص ۴۹۶)

انما اوتیته علیٰ علم کے متعلق لکھتے ہیں:۔

بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ قارون علم کیمیا کا ماہر تھا، اور اس کی بدولت اس کو

مال و دولت ملی تھی، مگر یہ بات مہمل ہے، اول تو یہ علم ہی باطل علم ہے، اس لیے کہ اشیاء میں قلب ماہیت کی قدرت اللہ کے سوا کسی کو نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا له

صحیح روایتوں میں مصوری کی بھی ممانعت کی گئی ہے، کیونکہ اس میں ظاہری شکل و صورت بنا کر خدا کی تخلیق کی نقل کی جاتی ہے، ایسی حالت میں جو لوگ قلب ماہیت یعنی ایک ذات کو دوسری ذات میں تبدیل کرنے کے مدعی ہیں ان کا دعویٰ کس قدر باطل اور جہل و ضلالت پر مبنی ہے۔ اور اس کے ثبوت میں کوئی نقلی دلیل نہیں پیش کی جا سکتی۔ البتہ بعض اولیاء اللہ کے ہاتھوں جو خوارق عادات اور کرامتیں ظاہر ہوتی ہیں ان کا کوئی مسلمان منکر نہیں لیکن ان کی نوعیت جدا ہے اور ان کو عمل صناعی سے کوئی تعلق نہیں۔ (ج ۳ ص ۳۹۹)

تحقیق و تنقید کے ضمن میں وہ تاریخی غلطیوں اور حوالوں کی بھی تردید کرتے ہیں، مثلاً حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں ایک شیخ اور اس کی دو لڑکیوں کا ذکر ہے۔ عام طور پر اس سے حضرت شعیبؑ کو مراد لیا جاتا ہے لیکن ابن کثیرؒ کے نزدیک یہ غلطی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں بہت تفاوت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قوم شعیب سے فرمایا تھا وما قوم لوط منکم ببعید۔ اور قرآنی تصریحات سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ قوم لوط کی ہلاکت حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں ہوئی تھی، اور تاریخی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے زمانہ میں تقریباً چار صدیوں کا فرق ہو، اسی لیے لوگوں نے اس اشکال سے بچنے کے لیے حضرت شعیبؑ کو طویل العمر بتایا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ شیخ مدین کے شعیبؑ ہونے کی کوئی قوی دلیل نہیں، اگر وہ فی الواقع حضرت شعیبؑ ہوتے تو قرآن مجید نے ان کے نام کی تصریح ضرور کی ہوتی۔ جن بعض روایتوں کی بنا پر ان کو شعیبؑ کہا جاتا ہے۔ ان کی سندیں درست نہیں

توراۃ سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی، اس میں ان کا نام شیرون بتایا گیا ہے، واللہ اعلم (ج ۳ ص ۴۴، ۳۰، ۳۵)

قرآن مجید میں ایک جگہ ام عیسیٰ یعنی حضرت مریمؑ کو یا اخت هارون سے خطاب کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی وجہ سے ان کو حضرت ہارونؑ اور موسیٰؑ کی بہن سمجھ لیا ہے، جو تاریخی غلطی ہے۔

ابن کثیر اس سلسلہ میں فرماتے ہیں :-

ظاہر ہے یہ مریمؑ حضرت موسیٰؑ وہارونؑ کی حقیقی بہن نہیں ہوسکتیں، کیونکہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ عام رسولوں کے بعد مبعوث کیے گئے اور ان کے بعد صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر ہوئے ہیں، صحیح بخاری میں بھی ہے کہ انا اولی الناس بابن مریم لانه لیس بینی وبینه نبی، ایسی صورت میں اگر محمد بن کعب قرظی کا بیان صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور بھی متعدد رسول حضرت عیسیٰؑ کے بعد آئے، جن کا زمانہ حضرت سلیمانؑ و داؤدؑ سے پہلے کا ہوگا، کیونکہ حضرت داؤدؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے بعد پیغمبر ہوئے تھے جیسا کہ الم تر الی الملاء من بنی اسرائیل من بعد موسی ...... الی قوله وقتل داؤد جالوت الآیات] سے ظاہر ہے۔

قرظی کی غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کے مصر سے نکلنے اور بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون کے غرقِ آب ہونے کے بعد یہ ذکر ہے کہ مریمؑ بنت عمران یعنی موسیٰؑ وہارونؑ کی بہن نے بنی اسرائیل پر خدا کے اس انعام کا شکریہ ادا کیا اور ان کے ساتھ دوسری عورتوں نے بھی دف بجانا شروع کیا تھا، قرظی کو اس سے یہ خیال ہوا کہ یہی حضرت عیسیٰؑ کی ماں بھی تھیں، جو سخت غلطی اور نہایت لغو بات ہے، حقیقت صرف اس قدر ہے کہ دونوں عورتوں اور ان کے والد کا ایک ہی نام تھا، یا اس لیے بھی قرین قیاس ہے کہ انبیاء وصلحاء کے ناموں پر نام رکھنے کا عام دستور تھا جیسا کہ امام احمد کی ایک روایت سے ظاہر ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغیرہ بن شعبہ کو جب نجران بھیجا تو انھوں نے اس آیت پر اعتراض کیا اور کہا کہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے زمانوں میں تو اس قدر تفاوت ہے، مغیرہ خاموش رہے اور واپس آکر آنحضورؐ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم نے یہ جواب کیوں نہیں دیا کہ بنی اسرائیل صلحاء اور انبیاء کے ناموں پر نام رکھتے تھے، ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے کعب کے اس قول کی کہ مریمؑ ہارونؑ وموسیٰؑ کی بہن نہ تھیں تردید کی تو انھوں نے کہا ام المومنین دونوں پیغمبروں کے درمیان چھ سو سال کا عرصہ ہے، اس پر وہ خاموش ہوگئیں۔ (ج ۳ ص ۱۱۹)

غلط روایتوں پر تنقید وہ دوران بحث میں غلط روایتوں کی بھی تردید کرتے ہیں۔ مثلاً یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب میں ابن عمرؓ سے ایک روایت ہے کہ سجل آنحضورؐ کے ایک کاتب کا نام تھا، اس پر نقد کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

یہ منکر روایت ہے، اور سرے سے صحیح نہیں اور ابن عباسؓ سے بھی جو روایت کیجاتی ہے، وہ ابوداؤد میں ہونے کے باوجود غلط ہے، حفاظ کی ایک جماعت نے اس کی وضعیت کی تصریح کردی ہے، ہمارے استاذ مزی نے اس کے ضعف پر ایک مستقل رسالہ تحریر کیا ہے، اور ابن جریر نے بھی اس کا نہایت پر زور رد کیا ہے، اس روایت کے ضعیف ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے تمام کاتبین نہایت مشہور لوگ ہیں اور ان کے نام جانے پہچانے ہیں، اور صحابہ میں بھی کسی کا نام سجل نہ تھا۔ (ج ۳ ص ۲۰۰)

اس قسم کی اور بھی مثالیں بکثرت ہیں، لیکن طوالت کے خوف سے ان کو قلم انداز کر دیا گیا، ابن کثیر نے حدیث کے ساتھ ساتھ آثار صحابہ اور اقوال تابعین بھی بکثرت نقل کیے ہیں، لیکن ان کی صحت جانچنے کے بعد، چنانچہ مجاہد، قتادہ، مکحول، سدی اور سعید بن مسیب وغیرہ تک کی روایتوں پر تنقید کی ہے، اور عموماً سلف کی تفسیروں کے پابند ہونے کے باوجود کہیں کہیں عام رائے سے بے اطمینانی ظاہر کی ہے، جس کی بعض مثالیں اوپر گذر چکی ہیں، یا مثلاً سورۂ حج کی آیت وما ارسلنا

من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنى القى الشيطان فی امنيته کے متعلق ان کو جمہور کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"اکثر مفسرین نے یہاں قصۂ غرانیق اور مہاجرین حبشہ کی اس بنا پر کہ مشرکین قریش نے اسلام قبول کر لیا ہے واپسی کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ سب مرسل روایتیں ہیں جو میرے نزدیک مستند نہیں ہیں، ان روایات کو محمد بن اسحاق نے سیرت میں نقل کیا ہے، لیکن یہ سب مرسل اور منقطع ہیں، بغوی نے بھی اپنی تفسیر میں ابن عباس اور محمد بن کعب قرظی سے اس طرح کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ایسی بات کس طرح صحیح ہو سکتی ہے، جبکہ نبی کریمؐ کی عصمت کا خود اللہ تعالیٰ ضامن ہو، پھر اس کے جوابات دیے ہیں، سب سے صحیح اور قرین قیاس یہ جواب ہے کہ شیطان نے اس بات کو مشرکین کے کانوں میں ڈالدیا تھا جس سے ان کو یہ وہم ہو گیا کہ رسول اللہؐ سے یہ بات صادر ہوئی ہے، حالانکہ فی نفسہ ایسا نہیں تھا، بلکہ یہ صرف شیطانی وسوسہ اور عمل تھا، رسول کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" (ج ۳ ص ۲۳۰)

سورہ ص کی آیت وهل اتاك نبؤا الخصم الخ کے متعلق ایک اسرائیلی روایت اکثر مفسرین نے نقل کی ہے، اور بعض نے اسے اختیار بھی کر لیا ہے، مگر ابن کثیر کو اس سے قطعی اختلاف ہے، اور وہ اس کو نقل کرنے کے بھی روادار نہیں،

"مفسرین نے اس موقع پر ایک قصہ لکھا ہے، جس کا اکثر حصہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے، کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں جس کا اتباع ضروری ہو، ابن ابی حاتم نے اس سلسلہ میں جو حدیث تحریر کی ہے، اس کی سند صحیح نہیں، اس لیے اس آیت کی تلاوت پر اکتفا کرنا چاہیے، اور اس کا علم خدا کے حوالہ کر دینا چاہیے، کیونکہ قرآن اور اس کے تمام مندرجات یقیناً حق و ثابت ہیں۔" (ج ۴ ص ۳۱)

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نقل و روایت میں مقلد جامد نہیں تھے، بلکہ ان کی تنقید و تردید بھی کرتے تھے لیکن عام طور سے جمہور کے مسلک سے نہیں ہٹتے تھے۔

بعض مواقع پر جمہور کے قول پر مفید اضافہ بھی کرتے ہیں، اس کی مثال "مثانی" کی تحقیق میں ملتی ہے۔

"صحیح روایتوں سے ثابت ہے کہ سبع مثانی سے سورۂ فاتحہ مراد ہے، جو بالکل صحیح ہے، مگر اس سے سات طویل سورتوں کے مثانی ہونے کی نفی نہیں ہوتی، کیونکہ ان میں بھی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے اور یہ روایت مکمل قرآن کو مثانی ماننے کے بھی منافی نہیں ہے، کیونکہ قرآن نے خود کہا ہے کہ الله نزل احسن الحديث كتابا متشابها مثانی۔ اور ولقد اتيناك سبعا من المثانی والقرآن العظیم۔ ہمارے اس خیال کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضورؐ سے جب اس مسجد کے متعلق جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے، دریافت کیا گیا تو آپ نے اپنی مسجد کی جانب اشارہ فرمایا۔ حالانکہ آیت میں مسجد قبا کا ذکر ہے، لیکن چونکہ اس مسجد کی تعمیر میں بھی وہ خصوصیت پائی جاتی تھی، اس لیے آپ نے اپنی مسجد کی طرف اشارہ کیا، اس لیے آپ کے قول کو قرآنی آیت کے منافی نہیں سمجھا جا سکتا۔ (ج ۲ ص ۵۵۷)

لیکن اس کے باوجود عموماً وہ جمہور اہل سنت والجماعت کے نقطۂ نظر سے کوئی بنیادی اختلاف نہیں کرتے، اور ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ علمائے تفسیر کے مختلف اقوال کا قدر مشترک تلاش کر کے اس کو ہم معنی ثابت کر دیں مثلاً ایک ہی آیت کی تفسیر میں سلف سے جو مختلف اقوال اور روایتیں مروی ہوتی ہیں، اگر ان کو دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو وہ عموماً سب قریب قریب ایک ہی معنی و مفہوم کی جانب رہنمائی کرتی ہیں، یا کم از کم ان میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں، بلکہ زیادہ تر تعبیر، تشریح اور الفاظ کا اختلاف ہوتا ہے،

اس مسئلہ میں انھوں نے اصولی طور پر اپنے مقدمہ میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، عطا بن ابی رباح، حسن بصری، مسروق اور سعید بن مسیب، ابو العالیہ، ربیع بن انس، قتادہ، ضحاک بن مزاحم وغیرہ تابعین و تبع تابعین کے اقوال جب کسی آیت کی تفسیر میں ذکر کیے جاتے ہیں تو

ان کی عبارتوں میں صرف لفظی اختلاف ہوتا ہے، جس کو بے علم اشخاص تضاد پر محمول کرکے متعدد اقوال سمجھتے ہیں، حالانکہ فی نفسہٖ ایسا نہیں ہوتا، کیونکہ بعض لوگ کسی چیز کی اس کے لوازم یا مظاہر سے تعبیر کرتے ہیں اور بعض اصل چیز کی تصریح کرتے ہیں، اور اکثر مواقع پر سب کے معنی ایک ہی ہوتے ہیں، ایک عقلمند آدمی کو یہ نکتہ سمجھ لینا چاہیے۔" (ج ۱ ص ۵)

اسی طرح وہ مختلف روایات و اقوال میں جمع و تطبیق کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے سورۂ قصص کی آیت لرادک الی معاد میں معاد کی تین تفسیریں منقول ہیں (۱) موت (۲) جنت (۳) مکہ۔ ان تینوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ مکہ کا مطلب وہ فتح مکہ ہے جو آنحضورؐ کی موت کی قربت کی دلیل ہے۔ اور روز قیامت مراد لینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہرحال موت کے بعد ہی ہوگا، اور جنت اس لیے کہ آپ کی جزاء اور ادائے رسالت کے صلہ میں آپ کا ٹھکانا وہی ہوگا۔ (ج ۳ ص ۴۰۳)

البدایہ والنہایہ یہ ابن کثیر کی دوسری مقبول اور مستند تصنیف ہے، جو دس جلدوں میں تھی، عام عرب مورخین کے دستور کے مطابق اس میں ابتدائے آفرینش سے اپنے عہد تک کے حالات و واقعات تحریر کیے ہیں، اس میں ۷۶۷ھ تک کے حالات ہیں۔ لیکن ابن کثیر نے ۷۳۸ھ تک کے حالات خود لکھے ہیں، اس کے بعد کے ۲۹ سال کے حالات ان کے کسی شاگرد کے قلم سے ہیں[۵]۔

اس کے دو حصے ہیں، حصہ اول ابتدائے آفرینش سے ہجرت نبویؐ تک کے واقعات و حالات پر مشتمل ہے، اس لحاظ سے اس کا نام بدایہ اور دوسرے حصہ میں ہجرت کے بعد سے اپنے عہد تک کے حالات سنہ وار بیان کیے ہیں، اس لیے اس کا نام النہایہ ہے۔

علماء و مورخین نے تفسیر کی طرح اس کو بھی اپنا ماخذ بنایا اور اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا، بعض نے اس کی تلخیص اور بعض نے اس پر ذیول لکھے ہیں، عینی کی تاریخ بدر کا اصل ماخذ یہی ہے، بلکہ

[۵] البدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۱۸۴

وہ اسی کی تلخیص ہے[۱]۔ احمد بن علی بن حجر (متوفی ۸۵۲ھ) نے بھی اس کی تلخیص کی ہے، اور محمود بن محمد بن دلشاد نے ترکی زبان میں اس کا ترجمہ کیا تھا[۲]، شہاب الدین بن حجی متوفی ۸۱۶ھ اور طرابلی متوفی ۸۳۵ھ نے اس کے ذیول لکھے ہیں[۳]۔

تاریخ ابن کثیر کے مختلف اجزا یورپ کے مختلف کتب خانوں اور کتبخانہ خدیو مصر میں موجود ہیں[۴]، مصر سے ۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۸ھ میں ایک مکمل کتاب ۱۴ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، جن کے صفحات کی مجموعی تعداد تقریباً پانچ ہزار ہے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت اس کی تحقیق و استناد ہے، مصنف نے کتاب و سنت اور علماء و مورخین کے مستند اقوال کو اپنا ماخذ بنایا ہے، اور غلط روایتوں اور اسرائیلی خرافات اور مرجوح و ناقابل اعتبار اقوال سے بچنے کی پوری کوشش کی ہے، اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں، انھوں نے اپنی تاریخ کے موضوع و ماخذ کی تفصیل خود مقدمہ میں تحریر کردی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"ہمارا ماخذ کتاب و سنت اور وہ اخبار و آثار ہیں جو معتبر علماء اور وارثین انبیاء کے نزدیک مقبول رہے ہیں، اسرائیلیات سے ناگزیر حد تک تعرض کیا جائیگا، اور ان سے صرف ایسی چیزیں لیجائیں گی جن کی اجازت خود شارع نے دی ہے، اور جو کتاب الٰہی اور سنت نبویؐ کے خلاف نہ ہونگی، وہ بھی ان مواقع پر جہاں اسرائیلیات سے کسی ایسے مختصر و مجمل امر کی تشریح و وضاحت یا کسی ایسی مبہم شی کی تعیین ہوتی ہوگی جس کا ہماری شریعت میں تذکرہ تو ہے لیکن بے سود اور غیر مفید سمجھکر اس کی کوئی تفصیل و تعیین نہیں کی گئی ہے، یہ بھی محض برسبیل تذکرہ ہوگا، ورنہ فی نفسہٖ نہ تو اس کی ضرورت ہے، اور نہ ان کو قابل اعتماد سمجھکر ایسا کیا جائے گا۔

[۱] کشف الظنون ج ۱ ص ۲۰۸، [۲] ایضاً [۳] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۳ ص ۱۹۴ [۴] ایضاً ۱۹۳

ہمارا دار و مدار صرف خدا کی کتاب یا ان حدیثوں پر ہوگا جن کا حسن و صحیح ہونا ثابت ہے، ضعیف روایات سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔" (ج ۱ ص ۶)

اس کی دوسری خوبی اس کا اختصار و جامعیت ہے، غیر ضروری چیزیں نظر انداز کر دی ہیں، لیکن ضروری اور قابلِ ذکر تمام معلومات موجود ہیں،

تیسری خوبی یہ ہے کہ واقعات و حالات کا تذکرہ سنہ وار ہے اور ہر سال اس دور کے تمام مشاہیر، امرا و سلاطین اور اکابر علما و فضلا، مفسرین، محدثین، فقہا، مورخین، ادبا، اور شعرا وغیرہ ہر طبقہ کے لوگوں کا اس میں تذکرہ آگیا ہے، اور دنیائے اسلام کی ممتاز و مایۂ ناز شخصیتوں کے حالات قلمبند ہوگئے ہیں۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ساتویں صدی ہجری کے آخر اور نصف آٹھویں صدی کے حالات کی تفصیل ہے، یہ زمانہ تاتاری حملوں کی وجہ سے تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس عہد کی بعض اور تاریخیں بھی ہیں جن میں کامل ابن اثیر زیادہ مشہور ہے، لیکن اول تو وہ اتنی مفصل نہیں، دوسرے ابن اثیر کا زمانہ آٹھویں صدی سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے، اس لیے اس میں اس اہم دور کے واقعات نہیں ہیں،

تفسیر کی طرح اس کی ترتیب و تدوین میں بھی انھوں نے پوری تلاش و تحقیق سے کام لیا ہے، اور اس وقت تک کے تمام ذخائر کتب سے استفادہ کیا ہے، علم الدین برزالی کی تاریخ ان کا سب سے اہم ماخذ ہے، جو صرف تاریخ و طبقات کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس میں دوسرے قسم کے دلچسپ معلومات بھی تحریر کیے گئے ہیں، اور حسب موقع ضمناً تفسیر و حدیث، فقہ و کلام اور دوسرے مباحث بھی ہیں،

بعض واقعات کی تفصیل بڑی عقیدت اور اہتمام سے لکھی ہے، مثلاً رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ،

امام احمد اور امام شافعی کے واقعات اور ان دونوں سے زیادہ ذوق و شوق کے ساتھ اپنے استاد علامہ ابن تیمیہ کا تذکرہ کیا ہے،

کتاب کے مضامین و مباحث کی اجمالی فہرست حسب ذیل ہے:۔

پہلی جلد میں تخلیق عالم، آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں (عرش، کرسی، لوح محفوظ، سدرۃ، سات زمینوں، سمندروں، دریاؤں، جزیروں، پہاڑوں، قوس و قزح، ملائکہ، جنات، شیطان وغیرہ) تخلیق آدم (اور اس سلسلہ کے واقعات) ہابیل قابیل اور حضرت شیثؑ و حضرت ادریسؑ و حضرت نوحؑ کے بعد سے حضرت موسیٰؑ تک کے پیغمبروں کا ذکر ہے،

دوسری جلد میں انبیائے بنی اسرائیل، عام قرآنی قصص (اصحاب الکہف، ذوالقرنین وغیرہ) بنی اسماعیل کے خانوادوں، زمزم اور جاہلی شعرا، اور دیگر مشہور شخصیتوں کا تذکرہ ہے۔

تیسری، چوتھی، پانچویں اور چھٹی جلد میں بھی ۳۰۰ صفحے تک آنحضورؐ کی حیات طیبہ کی تفصیل کے علاوہ غزوات، سرایا، ازواج مطہرات، سراری، اولاد و موالی، لونڈیوں، عام خادموں، کاتبین، مشاغل زندگی، ملبوسات، شمائل و اخلاق، دلائل نبوت اور معجزات وغیرہ کا ذکر ہے،

اس کے بعد کی جلدوں میں خلفائے راشدین، اموی، عباسی و فاطمی خلفا، سلاطین زندگی کے حالات اور ان کے عہد کے اہم واقعات اور لڑائیوں وغیرہ کی تفصیل کے علاوہ اس دور کی مشہور شخصیتوں اور ہر طبقہ کے اکابر کا بھی تذکرہ ہے۔

یہ کتاب کے مضامین کی مختصر اور اجمالی فہرست تھی، اس کی نوعیت کا صحیح اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے، ذیل میں اس کے چند اقتباسات دیے جاتے ہیں، جس سے اس کی اہمیت اور نوعیت کا تھوڑا بہت اندازہ ہوگا۔

آسمان و زمین کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

الحمد للہ الذی خلق السموات و	سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے پیدا کیے
والارض وجعل الظلمات و	آسمان اور زمین اور بنایا اندھیرا اور اجالا
النور ثم الذین کفروا بربھم	پھر بھی یہ کافر اپنے رب کے ساتھ
یعدلون (انعام)	اوروں کو برابر کیے دیتے ہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا:-

خلق السموات والارض وما	آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان
بینھما فی ستۃ ایام	جو کچھ ہے سب کو چھ دنوں میں پیدا کیا

اس طرح کی اور آیتیں بھی ہیں،

مفسرین نے چھ دنوں کے دو مفہوم بیان کیے ہیں:

(۱) جمہور کے نزدیک اس سے اسی طرح کے چھ دن مراد ہیں جس طرح کے ہمارے دن ہیں۔

(۲) ابن عباس مجاہد، ضحاک اور کعب احبار سے روایت ہے کہ ان میں سے ہر دن ایک ہزار برس کے برابر تھا، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اس کو نقل کیا ہے، امام احمد نے اپنی کتاب رد جہمیت میں اور ابن جریر اور متاخرین کے ایک گروہ نے بھی اسی کو ترجیح دیا ہے۔

اول دن کونسا تھا، اس کے متعلق حافظ ابن جریر نے تین اقوال نقل کیے ہیں، اہل تورات کے نزدیک یہ اتوار کا اور نصاریٰ کے خیال میں دوشنبہ کا اور مسلمانوں کے نزدیک سنیچر کا دن تھا، جس میں اللہ تعالیٰ نے تخلیق عالم کی ابتدا کی تھی،

ابن اسحاق نے مسلمانوں کے متعلق جس قول کی حکایت کی ہے اس کو فقہا شوافع کے ایک گروہ نے بھی اختیار کیا ہے، اور حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث میں بھی اس کا ذکر ہے۔

خلق اللہ التربۃ یوم السبت	اللہ نے خاک کو سنیچر کے دن پیدا کیا،

اتوار کے دن کے قائل سدی، ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور عبد اللہ بن سلام بھی ہیں، جیسا کہ ابن جریر نے ان بزرگوں سے روایت کی ہے، اور انھوں نے خود اسی کو مختار بتایا ہے بعض تورات سے بھی یہی قول ثابت ہوتا ہے اور فقہا کی جماعت کا بھی اسی جانب میلان ہے اور لفظ احد کی مناسبت سے بھی اسی دن کو ماننا زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے، دوسرے تخلیق کا عمل چھ دنوں میں ہوا تھا، اور آخری دن جمعہ کا تھا، اس لیے مسلمانوں کے ہفتہ کی عید یہی دن قرار پایا، اور اس دن کے بارہ میں اللہ نے اہل کتاب کو بھٹکا دیا۔

آسمان و زمین میں کس کی خلقت مقدم ہے | اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

ھو الذی خلق لکم ما فی الارض	وہی ہے جس نے تمھارے واسطے پیدا کیا
جمیعا ثم استویٰ الی السماء	وہ سب جو زمین میں ہے پھر آسمان کا
فسواھن سبع سمٰوات (بقرہ)	قصد کیا اور انکو ٹھیک کر دیا سات آسمان

دوسری جگہ ہے:-

قل أئنکم لتکفرون بالذی	تم کہہ دو کیا تم لوگ اس کے منکر ہو جس نے
خلق الارض فی یومین	دو دنوں میں زمین بنائی ...... اور اس میں
وجعل فیھا رواسی من فوقھا	بھاری پہاڑ اوپر سے رکھے اور اس کے
وبارک فیھا وقدر فیھا	اندر برکت رکھی اور روزیاں ٹھہرائیں۔
اقواتھا فی اربعۃ ایام	چار دنوں میں ..... پھر آسمان کا قصد کیا
ثم استویٰ الی السماء وھی دخان	اور وہ دھواں ہو رہا تھا، پھر اس سے
فقال لھا وللارض ائتیا طوعا	اور زمین سے کہا تم دونوں خوشی

ادکرھا قالتا اتینا طائعین فقضاھن	یا ناگواری سے آؤ۔ ان دونوں نے کہا ہم خوشی
سبع سمٰوات فی یومین واوحی فی	سے آئے، پھر دو دن میں ان کو سات آسمان
کل سماء امرھا وزینا السماء الدنیا	کردیے اور ہر آسمان میں اس کا حکم اتارا اور
بمصابیح وحفظا (حم السجدہ)	قریبی آسمان کو چراغوں سے رونق دی اور محفوظ کردیا،

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زمین کو آسمان سے پہلے پیدا کیا گیا۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

اللہ الذی جعل لکم الارض	اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو ٹھہرنے
قرارا والسماء بناءً وصورکم	کی جگہ اور آسمان کو عمارت بنایا اور تمہاری
فاحسن صورکم	صورت بنائی تو اچھی بنائی۔

ایک اور جگہ فرمایا:۔

الم نجعل الارض مھاداً والجبال	کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا اور پہاڑوں کو
اوتادا..... وبنینا فوقکم سبعا	میخیں ..... اور تمہارے اوپر سات سخت (آسمان)
شدادا وجعلنا سراجا وھاجا (نبا)	بنائے اور ایک چمکتا ہوا چراغ۔

نیز فرمایا:

الم یر الذین کفروا ان السموات	کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان وزمین کے
والارض کانتا رتقا ففتقناھما	منہ بند تھے، پھر ہم نے ان کو کھول دیا اور پانی سے
وجعلنا من الماء کل شیٔ حی ... (انبیاء)	ہر جاندار چیز بنائی۔

یعنی آسمان وزمین کی چیزوں کو الگ الگ کیا، یہاں تک کہ ہوائیں چلیں، بارش ہوئی، چشمے ابلے، نہریں جاری ہوئیں اور حیوانات کو نشوونما اور زندگی ملی۔

جو لوگ اس آیت

أانتم اشد خلقا ام السماء بناھا	کیا تمہارا بنانا مشکل ہے یا آسمان کا، اس نے اس کو
رفع سمکھا فسواھا واغطش لیلھا	بنایا اور اس کا ابھار اونچا کیا اور پھر اس کو برابر
واخرج ضحاھا والارض بعد ذالک	کیا اور اس کی رات اندھیری کی اور اسکی دھوپ
دحاھا واخرج منھا ماءھا ومرعاھا	نکالی اور اس کے بعد زمین کو صاف بچھا دیا۔
والجبال ارساھا	اور زمین کے باہر نکالا اس کا چارا اور پانی
(نازعات)	اور پہاڑوں کو قائم کردیا

سے آسمان کے پہلے پیدا کیے جانے کی دلیل قائم کرتے ہیں وہ پہلی دونوں آیتوں کی صریح مخالفت بھی کرتے ہیں اور اس آیت کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے ہیں، کیونکہ اس میں بالفعل زمین کے دحی اور اس سے پانی اور چراگاہ کے نکالنے کو آسمان کی خلقت کے بعد بتایا گیا ہے اور اس کے متعلق بالقوۃ اندازہ کرلیا گیا تھا، جیسا کہ فرمایا (وبارک فیھا وقدر اقواتھا) یعنی زراعت کے مقام اور چشموں اور دریاؤں کی جگہوں کا تعین کرلیا گیا تھا، پھر جب اللہ تعالیٰ عالم سفلی وعلوی کی تخلیق کا نقشہ مکمل کرچکا تو زمین کا دحی (صاف بچھانا) کیا، اور اس سے وہ سب چیزیں پیدا کیں جس کا پہلے اندازہ کرچکا تھا، یعنی چشمے، نہریں، نباتات اور پھل اور سبزے وغیرہ، اسی لیے دحی کی تفسیر پانی نکالنے، چراگاہ اگانے اور پہاڑ گاڑنے سے بھی کی گئی ہے۔

اس آیت

والسماء بنیناھا باید وانا لموسعون	آسمان کو ہم نے قوت سے بنایا اور ہم کو سب
والارض فرشناھا فنعم الماھدون (ذاریات)	مقدور ہے اور زمین کو بچھایا ہم نے سو کیا خوب بچھایا،

سے بھی آسمان کے پیدا کیے جانے کا ثبوت نہیں ملتا، کیونکہ واؤ زبان کے استعمالات میں مطلق خبر دینے کے لیے بھی آتا ہے، اور واقعات کی ترتیب ضروری نہیں ہوتی .....

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت (جس کا پہلے ذکر آیا تھا) یہ ہے :-

اخذ رسول اللہ بیدی فقال خلق اللہ التربۃ یوم السبت وخلق الجبال یوم الاحد وخلق الشجر یوم الاثنین وخلق المکروہ یوم الثلاثاء وخلق النور یوم الاربعاء وبث الدواب یوم الخمیس وخلق آدم بعد العصر یوم الجمعۃ آخر خلق فی آخر ساعۃ من ساعات الجمعۃ فیما بین العصر الی اللیل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ اللہ نے خاک کو شنبہ، پہاڑوں کو یکشنبہ درختوں کو دوشنبہ، مکروہات کو سہ شنبہ اور روشنی کو چہارشنبہ کو پیدا کیا، اور پنجشنبہ کو چوپائے پھیلائے اور آدم کو جمعہ کے دن عصر بعد پیدا کیا، اور یہ آخری خلقت روز جمعہ کے آخری وقت میں یعنی عصر بعد اور رات کے آنے سے پہلے پیدا کی گئی۔

...... لیکن علی بن مدینی، امام بخاری اور بیہقی وغیرہ ائمہ وحفاظ حدیث نے اس روایت میں کلام کیا ہے، امام بخاریؒ تاریخ میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے اس حدیث کو کعب سے سنا تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ رہتے اور حدیثوں کا باہم مذاکرہ کرتے تھے، ایک اپنے صحیفوں سے اور دوسرا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں بیان کرتا تھا جن سے اس کی تصدیق ہوتی تھی چنانچہ یہ حدیث بھی حضرت ابوہریرہؓ نے کعب سے ان کے صحیفہ کے ذریعہ روایت کی ہے۔ اس میں بعض راویوں کو وہم ہوا ہے، اور انھوں نے مرفوع کرنے کے لیے (اخذ بیدی) کا ٹکڑا لگا دیا،

اس کے علاوہ اس روایت کے متن میں شدید غرابت ہے، وہ یہ کہ اس میں آسمانوں کے پیدا کیے جانے کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے، صرف زمین کے سات دنوں میں بنائے جانے کا ذکر ہے جو صراحۃً قرآن کے

خلاف ہے ...... ان اسناد میں بھی جن کو سدی بیان کرتے ہیں متعدد غرابتیں ہیں، اور اس روایت کا اکثر حصہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے، کعب احبار حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلام لائے تھے، اور حضرت عمرؓ کے سامنے اہل کتاب کے علوم بیان کرتے تھے، وہ کچھ ان کی تالیف قلب اور کچھ اس لیے کہ یہ روایتیں شریعت کے مطابق ہوتی تھیں ان کو سنا کرتے تھے، اور چونکہ بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی ممانعت نہ تھی، اکثر لوگوں نے کعب احبار کی روایات کو نقل کرنا جائز سمجھا، حالانکہ ان کی اکثر روایتوں میں بڑی غلطیاں اور لغزشیں بھی ہوتی ہیں، چنانچہ امام بخاری نے حضرت معاویہؓ سے روایت کی ہے کہ وہ کعب احبار کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ گو ان لوگوں کے مقابلہ میں جو بنی اسرائیل سے روایتیں کرتے تھے، کعب زیادہ سچے ہیں، لیکن ہم کو ان کے کذب کا بھی تجربہ ہے۔" (ج ۱ ص ۱۵ تا ۱۸)

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن کثیرؒ تفسیر و حدیث کے کیسے اہم نکتے اپنی تاریخ میں بیان کرتے ہیں، اور تنقید روایات کا بھی پورا حق ادا کرتے ہیں، اور اسرائیلی خرافات کی تردید بھی کرتے جاتے ہیں۔

اسی قسم کی ایک مثال پانچویں جلد میں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں حضرت علیؓ کی تاخیر اور حضرت فاطمہؓ کے باغ فدک کی وراثت کے مطالبہ کے سلسلہ میں ملتی ہے، جس سے ان دونوں واقعات کی حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

ابن کثیرؒ نے اس کو تسلیم کیا ہے کہ حضرت فاطمہؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے آزردہ ہو گئی تھیں لیکن اس سے حضرت ابوبکرؓ پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا، حضرت فاطمہؓ ایک عورت تھیں، اور عام عورتوں کی طرح ان کو بھی غصہ اور ملال ہو سکتا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اس آزردگی کی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئیں، بلکہ حضرت صدیقؓ کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ

ایک طرف تو انھوں نے اتنی شدت دکھائی کہ دین اور سنت نبوی کے مقابلہ میں خود نبی کی بیٹی کی ناراضگی کی پروا نہ کی اور دوسری طرف نرمی و ملاطفت سے حضرت فاطمہؓ کی برابر دلجوئی کرتے رہے؛ اور بیماری کے زمانہ میں ان کو راضی بھی کر لیا تھا۔

اس تاریخ میں ہندوستان کا ذکر بھی کئی مقامات پر آیا ہے۔

پہلی جلد میں جزیروں کے بیان میں جزائر ہند کا ذکر کیا ہے[1]، اسی جلد میں حضرت آدمؑ کے ہبوط کے سلسلہ میں بھی ہندوستان کا ذکر آیا ہے[2]، چھٹی جلد میں آنحضورؐ کے معجزات اور پیشین گوئیوں میں فتح ہند و سند کا ذکر ہے[3] اور آخری جلد میں ہندوستان کے نامور عالم اور شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کے معاصر صفی الدین ہندی کا تذکرہ ہے[4]۔

استدراک:۔ اس مضمون کی پہلی قسط میں ابن کثیرؒ کے رسالہ فضائل القرآن کا تذکرہ کرتے ہوئے قیاس سے اس کو انکی تصنیف شرح بخاری کا ایک جزء بتایا گیا تھا لیکن تفسیر القرآن اور تاریخ البدایہ والنہایہ کے استقصاء کے بعد یہ قیاس غلط نکلا، وہ رسالہ دراصل ان کی تفسیر القرآن کا مقدمہ ہے، اور مصنف نے خود اس کی تصریح تفسیر و تاریخ دونوں میں کی ہے۔

[1] ج ۱ ص ۲۵ [2] ج ۱ ص ۸۰ [3] ج ۶ ص ۲۳۲ [4] ج ۱۴ ص ۴۷، ۷۵۔

حکمائے اسلام حصہ اول

یہ کتاب دوسری صدی سے لیکر خاندان خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات میں ہے، جلد اول پانچویں ہجری تک کے حکماء کے حالات پر مشتمل ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے،

(از مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم) ۵۰۴ صفحے قیمت [illegible]

منیجر

نقد النثر کا مصنف

اور

کتاب کے مباحث و خصوصیات

از

جناب سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے، بی ٹی، پی ایچ ڈی، لکچرر شعبۂ عربی ونکٹیشور یونیورسٹی

اسحاق بن ابراہیم کی شخصیت دور جدید میں نمایاں ہو کر اہل علم کے سامنے آئی ہے، اگرچہ اس کی کتاب "نقد النثر" کے نام سے دار الکتب المصریہ سے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے مقدمہ کے ساتھ عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے، مگر اسحاق بن ابراہیم کے بجائے قدامہ بن جعفر کے نام سے شائع ہوئی تھی، اس لیے بہت سے فضلا نے اس کو تسلیم نہیں کیا، کتاب کے شروع میں عبد الحمید کے قلم سے ایک تحریر ہے، جس میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کتاب کا مصنف قدامہ بن جعفر ہے، مگر ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنے مقدمہ میں بڑی اہم اور قابل قدر رائے کا اظہار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب کسی شیعہ فقیہ کی تصنیف ہے جو جگہ جگہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ائمہ کے اقوال سے استشہاد کرتا ہے[1]،

"نقد النثر" کا جو نسخہ "اسکوریال" میں محفوظ ہے اس کے اوپر یہ عبارت درج ہے:

"للشیخ الفقیہ المکرم أبی عبد اللہ محمد بن ایوب"۔

اس عبارت سے بعضوں کو یہ شبہہ ہوا کہ یہ کتاب محمد بن ایوب کی تصنیف ہے، یہ بھی خلاف واقعہ ہے،

[1] نقد النثر مرتبہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین و عبد الحمید عبادی مطبوعہ دار الکتب المصریہ، قاہرہ ۱۹۳۳ء ص ۱

کتاب کا نام بھی "نقد النثر" نہیں ہے اور نہ مصنف ہی کی نسبت صحیح ہے، اس کا انکشاف اصل میں اس کتاب کے اس نسخہ سے ہوتا ہے جو "کتب خانہ اسکوریال" میں حسن عبد القادر کو ملا ہے، کتاب نمبر (حی) کے تحت مذکورہ کتب خانہ میں موجود ہے، اس نسخہ میں کتاب کا نام "کتاب البرہان فی وجوہ البیان" اور مصنف کا نام "ابو الحسن اسحاق بن ابراہیم بن وہب الکاتب" درج ہے، کہیں بھی محمد بن ایوب کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکوریال کے نسخہ کی ابتدا میں محمد بن ایوب کا نام مصنف کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ اس کے مالک کی حیثیت سے تحریر ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور قابل غور ہے، مصنف نے کتاب کی بحثوں کے درمیان اپنی چار کتابوں کا ذکر کیا ہے، (۱) کتاب الحجۃ (۲) کتاب الایضاح (۳) کتاب التعبد (۴) کتاب اسرار القرآن،

قدامہ بن جعفر کی تصنیفات میں کسی مورخ نے مذکورہ کتب کا ذکر نہیں کیا ہے[1]، اس سے اتنا تو بہر حال ثابت ہو جاتا ہے کہ قدامہ بن جعفر اس کتاب کا مصنف نہیں ہے، اور عبد الحمید عبادی کو اس سلسلہ میں غلط فہمی ہوئی، اس میں شبہ نہیں کہ قدامہ بن جعفر نے "نقد الشعر" میں جو نظریات پیش کیے ہیں، اس کتاب میں بھی وہ موجود ہے، مگر یہاں مصنف کا اسلوب قدامہ بن جعفر سے بالکل مختلف ہے، نثر کی تنقید پر بھی قدامہ بن جعفر کی جانب منسوب ایک کتاب "صناعۃ الکتابۃ" کے نام سے موجود ہے، مگر اس کی نسبت بھی اس کی جانب صحیح نہیں ہے،

قدامہ کی زبان نہایت سلیس اور سادہ ہے، اور نقد النثر کی زبان منطقی اور فلسفیانہ طرز استدلال سے پُر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف نے ارسطو کی "کتاب الخطابۃ" "کتاب الشعر" کے علاوہ "کتاب الجدل" سے بھی بہت کچھ استفادہ کیا ہے، چونکہ قدامہ نے بھی "کتاب الشعر" ہی سے

[1] قدامہ والنقد الادبی مولفہ ڈاکٹر بدوی طبانہ ۱۹۵۸ء مطبعۃ الرسالۃ مصر، ص ۱۱۵

فائدہ اٹھایا ہے، اس لیے شاعری کی تنقید کے بارے میں دونوں کے خیالات بنیادی طور پر مشابہ ہو گئے ہیں، عبد الحمید عبادی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ دونوں کتابوں کا مصنف قدامہ بن جعفر ہے۔

یہ خیال ایک دوسرے نقطۂ نظر سے بھی غلط اور بعید از قیاس ہے، قدامہ بن جعفر اور مصنف "نقد النثر" کے بعض خیالات میں مشابہت کے باوجود بہت بڑا فرق ہے، قدامہ کذب و مبالغہ کو جائز قرار دیتا ہے، فن میں اخلاق کی پروا نہیں کرتا، قرآن مجید اور احادیث سے استشہاد نہیں کرتا، بلکہ قدیم و جدید سے مثالیں پیش کرتا ہے، نقد الشعر میں تلاش سے قرآن و حدیث سے چند مثالیں مل سکیں گی، اس کے مقابلہ میں نقد النثر قرآن و حدیث کی مثالوں سے معمور ہے، اس کے مصنف کے نزدیک وہ خیال ہی باطل ہے، جو کسی مذہبی ضرورت کو پورا نہ کرتا ہو، ایسی صورت میں دونوں ناقدوں کا طرز فکر ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہو جاتا ہے، ان وجوہ کی بنا پر ڈاکٹر بدوی طبانہ نے عبد الحمید عبادی کی رائے کو خلاف حقیقت قرار دیا ہے،

اس سلسلہ میں ایک پہلو اور قابل غور ہے، جو کتاب "نقد النثر" کے نام سے شائع ہوئی ہے وہ بہت ناقص ہے، اس کا جو نسخہ حسن عبد القادر کو "اسکوریال" میں ملا ہے وہ بہت ضخیم ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف نے کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے،

(۱) بیان الاعتبار (۲) بیان الاعتقاد (۳) بیان العبارت (۴) بیان الکتاب،

کتاب کا جو نسخہ "نقد النثر" کے نام سے شائع ہوا ہے، اس میں چوتھا باب نہیں ہے، اور یہ باب اتنا طویل ہے کہ کتاب کے دو تہائی حصہ پر محیط ہے[1]، اس لیے عبد الحمید عبادی کا یہ خیال کہ "بیان الکتاب" بھی مطبوعہ کتاب نقد النثر میں موجود ہے اور کتاب مکمل ہے، صحیح نہیں ہے،

[1] قدامۃ والنقد الادبی مؤلفہ بدوی طبانہ، ص ۱۲۲

ان مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کتاب کا نام "نقد النثر" کے بجائے "کتاب البرہان فی وجوہ البیان" ہے اور قدامہ بن جعفر اور محمد بن ایوب کی جانب اس کی نسبت صحیح نہیں ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر کتاب کے مباحث پر بھی ڈال لی جائے اور ان خیالات کا تجزیہ کیا جائے جن پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ کیونکہ نثر کی تنقید پر عصر عباسی میں یہ بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

اسحاق بن ابراہیم نے بہت منطقیانہ انداز سے نثر کی تنقید کی ہے، وہ تمام فضائل کا مرجع عقل کو بتاتا ہے، اور عقل کی دو قسمیں قرار دیتا ہے، ایک عقل موہوب، دوسری عقل مکسوب؛ عقل مکسوب وہ ہے جو انسان کو ادب کے مطالعہ، علم اور تجربہ سے حاصل ہوتی ہے، اگر عقل موہوب نہ ہو تو پھر عقل مکسوب بالکل بے کار ہے، بلکہ وہ حاصل ہی نہیں ہو سکتی، اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ زبان کے الکتاب میں عقل کو بڑا دخل ہے۔

اس کے بعد "بیان" کا ذکر ہے، مصنف کے نزدیک "بیان" "عقل" کا ترجمان ہے، بیان کی چار قسمیں ہیں:

(۱) ذوات اشیاء کا بیان جو واضح نہ ہوں،

(۲) وہ بیان جو قلب کو فکر کے موقع پر حاصل ہوتا ہے،

(۳) وہ بیان جس کا اظہار نطق سے زبان کے ذریعہ ہوتا ہے،

(۴) بیان جو کتابت کے ذریعہ ہوتا ہے، اور اس کو بھی پہنچ جاتا ہے جو غائب ہو یا دور ہو۔[1]

پھر ان اقسام کو ظاہر و باطن میں تقسیم کیا ہے، چنانچہ لکھتا ہے کہ ظاہر باطن کا محتاج ہے، اسکے بغیر ظاہر کے کوئی معنی ہی نہیں، اسی طرح باطن بھی ظاہر کا محتاج ہے، کیونکہ باطن پر ظاہر دلیل ہے،

۱؎ نقد النثر ص ۸

ظاہر اپنے ظہور کی وجہ سے استدلال سے مستغنی ہے لیکن باطن تشریح اور استدلال کا محتاج ہے، کیونکہ وہ حس کی دسترس سے باہر ہے، اس کے اثبات میں عقلوں کا اختلاف ہوتا ہے، باطن اشیاء کا علم قیاس و خبر سے ہوتا ہے، قیاس کی تین قسمیں ہیں، زبان میں قیاس تشبیہ و تمثیل میں واقع ہوتا ہے، اور تشبیہ و تمثیل کا استعمال ہر جگہ ممکن نہیں ہے، اور بعض قیاس صادق ہوتے ہیں (مثلاً اگر تشبیہ میں بھی مشابہت ہو) تشبیہ کو وصف محکم بناتا ہے، مگر جب تک وہ پہلے سے ذہن میں نہ ہو، اس کے بارے میں قیاس ممکن نہیں۔[1]

اس کے بعد "خبر" کی بحث ہے، خبر کی دو قسمیں ہیں، یقین اور تصدیق۔ پھر یقین کی تین قسمیں ہیں:

(۱) خبر تواتر جو ایک جماعت کے ذریعہ معلوم ہوئی ہو،

(۲) انبیاء اور ائمہ کے ذریعہ خبر

(۳) خواص کی فراہم کردہ خبریں جو عوام کے مشاہدہ میں نہ آئی ہوں۔

جو خبر ایک شخص یا دو اشخاص کے ذریعہ ملے اور تواتر تک نہ پہنچے وہ "تصدیق" ہے۔

باطن اشیاء کا علم ظن و تخمین کے ذریعہ بھی حاصل کیا جاتا ہے۔[2]

اس کے بعد دوسرے بیان "اعتقاد" پر بحث ہے، اس کی تین قسمیں قرار دی ہیں: (۱) حق جس میں شبہہ کی گنجائش نہ ہو (۲) باطل جس میں شک نہ ہو (۳) علم مشتبہ جو استدلال کا محتاج ہو۔[3]

اس کے بعد تیسرے بیان "عبارت" پر بحث ہے، بیان اظہار قول کا نام ہے، جو زبان کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، اس میں بھی بعض کو بعض کی احتیاج ہوتی ہے اور بعض کو نہیں۔ آگے چل کر معارف کے بیان میں تقیہ کا ذکر ہے، جو مصنف کے تشیع کو ظاہر کرتا ہے۔

اس مطبوعہ نسخہ میں بیان الکتاب کا حصہ نہیں ہے، اس لیے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا،

۱؎ نقد النثر ص ۱۵، ۱۶، ۱۷ ۲؎ ایضاً ص ۲۳، ۲۴، ۲۵ ۳؎ ایضاً ص ۳۱

اس بحث سے یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ نثر کی تنقید کا جو مطلب آج ہم سمجھتے ہیں یہ کتاب اس سے بالکل مختلف ہے، اس میں نہ اسالیب نثر کا ذکر ہے اور نہ نثر کے حسن و قبح پر بحث ہے، اس کی بحثیں منطقیانہ انداز کی ہیں، جو زیادہ تر ارسطو کی کتاب الجدل سے ماخوذ ہیں،

"بیان عبارت" میں مصنف نے یہ بات بڑے پتہ کی کہی ہے کہ اگرچہ یہ اقسام دوسری زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں، مگر عربوں کے یہاں اشتقاق، تشبیہ، لحن، رمز، وحی، استعارہ، امثال، حذف، صرف، مبالغہ، قطع، عطف، تقدیم، تاخیر اور اختراع کے استعمال زیادہ اور متنوع ہیں، جو دوسری زبانوں میں نہیں پائے جاتے،[1]

تشبیہ کے بارے میں مصنف کی رائے ہے کہ وہ کلام عرب میں سب سے بہتر طریقۂ اظہار ہے، اشیاء کی تشبیہ ظواہر اور الوان میں اسی طرح ہوتی ہے جس طرح معانی میں ہوتی ہے،[2]

استعارے کی بحث میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ استعارہ کی ضرورت عربوں کو اس لیے پیش آئی کہ ان کے یہاں الفاظ معانی سے زیادہ ہیں، یہ خصوصیت کسی دوسری زبان کو عربی کے علاوہ حاصل نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ایک معنی کو مختلف پیرایوں میں ظاہر کرتے ہیں، اور کبھی ایک معنی کو مجازاً دوسرے کی جگہ بھی استعمال کرتے ہیں،[3]

امثال کے متعلق لکھتے ہیں کہ خبر بذات خود ثبوت کے لیے کافی نہیں ہوتی، بلکہ تشریح اور تعبیر کی محتاج ہوتی ہے، نظائر و امثال سے احوال کا تصرف واضح کیا جاتا ہے، مثل اپنے ساتھ حجت بھی رکھتی ہے، جو اس کے اثر کو بڑھا دیتی ہے،[4]

مبالغہ کی دو قسمیں ہیں، ایک مبالغہ لفظ میں ہوتا ہے، دوسرا معنی میں، دونوں کلام میں مستحسن ہیں۔[5]

[1] نقد النثر ص ۳۷ [2] ایضاً ص ۴۹ [3] ایضاً ص ۵۵ [4] ایضاً ص ۵۷ [5] ایضاً ص ۷۱

بلاغت ایسا قول ہے جو معنی مقصود پر محیط ہو اور انتخاب کلام، حسن ترکیب اور فصاحت لسان پر مشتمل ہو، بلاغت کی تعریف میں مصنف نے جاحظ پر تنقید کی ہے، بلکہ یہ کتاب ہی درحقیقت جاحظ کے خلاف لکھی ہے، چنانچہ مقدمہ میں بتایا ہے کہ چونکہ جاحظ نے کتاب "البیان والتبیین" میں علم بلاغت اور دوسری اقسام زبان کا حق ادا نہیں کیا ہے، اس لیے اس کتاب میں اس پر مکمل بحث کی گئی ہے،

مصنف کے نزدیک نثر نظم سے افضل و اشرف ہے، نظم کا دائرہ اس لیے محدود ہے کہ اس میں وزن و قافیہ کی پابندی ہوتی ہے، اس کے برعکس نثر کا دامن وسیع ہے اور اس میں آسانی سے بات کہی جاسکتی ہے،[1]

مصنف نے گفتگو پر بھی بحث کی ہے، اور اس کی کئی قسمیں لکھی ہیں، سنجیدہ، غیر سنجیدہ، پرکشش اور بے کیف، صحیح اور غلط ہر طرز کی گفتگو ہو سکتی ہے، "انواع الحدیث" میں اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے،[2]

مصنف کے زمانہ میں نثر کی تنقید عہد طفولیت میں تھی، یوں بھی عرب ناقدوں نے جتنی توجہ نظم کی تنقید پر کی اتنی نثر پر نہیں کی، مصنف نے نثر کو خطابت، رسالہ (خطوط) احتجاج (بحث و مناظرہ) اور گفتگو (حدیث) میں تقسیم کیا ہے، اور بتایا ہے کہ الفاظ و معانی کا استعمال اس طرح ہونا چاہیے کہ ان میں تکلف نہ ہو اور ایک قسم کی فطری روانی   کلام میں ہونی چاہیے، سجع کا استعمال بھی اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب اس میں تکلف کی جھلک نہ ہو، لیکن ہر جگہ سجع کا استعمال بہت قبیح ہے، اس سے زبان کا فطری حسن باقی نہیں رہ جاتا۔ خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ تحمید (حمد) سے کلام شروع کرے، طویل خطبوں میں

[1] نقد النثر ص ۶۶ [2] ایضاً ص ۴۶ [3] ایضاً ص ۱۱۸ [4] ایضاً ص ۹۲-۹۳

اشعار استعمال نہ کرے، خطوط جو بادشاہوں کو لکھے جائیں ان میں بھی اشعار کا استعمال نامناسب ہے، ان کے علاوہ دوسرے خطوط میں اشعار استعمال کیے جاسکتے ہیں اور چھوٹے خطبوں میں بھی، شعر میں جو حسن و صفات مطلوب ہیں، قریب قریب وہی نثر میں بھی مطلوب ہیں، ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ موقع و محل کی رعایت سے الفاظ استعمال کرے، جو اسلوب جس جگہ مناسب ہے وہی اختیار کرے، عامی الفاظ و اسلوب خواص کے لیے استعمال نہ کرنے چاہئیں، اور جو الفاظ و اسلوب بادشاہوں و خواص کے لیے مخصوص ہیں ان کو عوام کے لیے استعمال نہ کیا جائے، صاحب فکر و نظر ادیب کے لیے ایجاز کا استعمال بہتر ہے، اور عوام کے لیے طوالت اور تکرار، ایجاز کا استعمال مناسب مواقع پر بہت بلیغ ہوتا ہے، اس سے قاری یا سامع اکتاتا نہیں، قدماء اختصار و ایجاز کا بہت لحاظ رکھتے تھے، ارسطو و اقلیدس نے جو کچھ لکھا ہے اس کا اختصار ممکن نہیں، کیونکہ اس سے کم الفاظ میں مفہوم ادا نہیں ہوسکتا،[1]

مصنف نے شعر کی تنقید پر جو کچھ لکھا ہے، وہ قدامہ بن جعفر سے بہتر نہیں ہے، بلکہ اسی کے خیالات خراب اسلوب میں پیش کردیے ہیں، سب سے پہلے شعر کی اہمیت بیان کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ شعر اسلام میں مذموم نہیں ہے، اور اشعار کی اہمیت کے ثبوت میں اس نے ارسطو کو پیش کیا ہے، کہ اس نے کتاب الجدل اور کتاب السیاستہ میں یونانی شعراء کے اشعار سے استشہاد کیا ہے، شعر جتنا قدیم ہوگا، اتنا ہی قابل حجت ہوسکے گا،[2]

شعر کی چار قسمیں کی ہیں، مدح، ہجو، حکمت اور لہو، باقی اصناف شاعری ان ہی چاروں سے متفرع ہیں، یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ قدامہ بن جعفر نے شعر کو چھ[3] اصناف

---

[1] نقد النثر ص ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵ [2] [3] ایضاً ص ۶۹

میں تقسیم کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ دراصل صرف دو قسمیں ہیں، ایک مدح، دوسرے ہجو، اسحاق بن ابراہیم نے ان چاروں اقسام سے متفرع اصناف کا نقشہ یہ پیش کیا ہے:

۱- مدح: مرثیہ، فخر، شکر اور سوال (مانگنا)

۲- ہجو: ذم، تنبیہ، زجر وغیرہ،

۳- حکمت: امثال، زہد اور مواعیظ وغیرہ

۴- لہو: غزل، خمریات اور عاشقانہ اشعار[1]

اس طرز کی تقسیم عربی کے کسی ناقد نے نہیں کی ہے، اس لیے محل نظر ہے، مصنف نے اصناف کی تقسیم سے زیادہ مضامین شعر کو مدنظر رکھا ہے۔

"فضائل نفسیہ" کا ذکر بھی مصنف نے کیا ہے، یعنی مدح میں عقل، عفت، شجاعت اور عدل جیسی اعلیٰ صفات کو پیش کیا جائے، جسمانی صفات کا بیان شعر کو اعلیٰ معیار تک نہیں پہنچاتا، اس سلسلہ میں قدامہ کا نظریہ مشہور ہے، اس نے نقد الشعر میں اس کی بہت تفصیل و تشریح کی ہے۔

ارسطو کے حوالہ سے مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ شعر کے علاوہ اور کسی کلام میں کذب جائز نہیں ہے،[2]

وہ اشعار جن میں جودت، اور آمد ہو، تکلف نہ ہو وہ خواہ تعداد میں کم ہوں، ان بہت سے اشعار سے بہتر ہیں جن میں شعریت نہ ہو اور تکلف ہو، اصل معیار بلندی ہے نہ کہ تعداد،[3] مصنف کے نزدیک بہترین شعر وہ ہے جس میں حسن نظم، جزالت الفاظ، اعتدال وزن اصابت تشبیہ اور قلت تکلف پایا جائے۔

ناقد نے ان مباحث میں زیادہ تر یونانی خیالات سے اثر قبول کیا ہے، وہ بھی کتاب الشعر

---

[1] نقد النثر ص ۷۰، [2] ایضاً ص ۹، [3] ایضاً ص ۷۳

کتاب الخطابت اور کتاب الجدل کے عمیق خیالات تک رسائی کے بغیر، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان اصطلاحات اور اصناف سے عرب واقف نہ تھے، جو اہل یونان کے یہاں موجود تھیں، اسی لیے ابن سینا تک نے کتاب الشعر کی جو شرح لکھی اس میں بھی وہ کامیڈی اور ٹریجڈی کا مطلب صحیح طور سے واضح نہ کر سکے اور ان کو مدح و مرثیہ سے تعبیر کیا۔[۱]

اس کتاب سے پہلے نثر کی تنقید پر چند کتابیں نظر آتی ہیں، مگر خود ناقد کی تاریخ ولادت و وفات ابتک نامعلوم ہے۔ اس لیے یہ فیصلہ دشوار ہے کہ بقیہ کتابیں اس سے پہلے کی ہیں یا بعد کی، ابن قتیبہ کی ادب الکاتب تو یقیناً اس سے پہلے کی ہے، ممکن ہے عبد الرحمن بن عیسیٰ ہمدانی کی "آداب الرسائل" اور ابوبکر صولی کی ادب الکتاب، البرہان سے کچھ پہلے یا بعد میں لکھی گئی ہوں، مگر یہ مسلّم ہے کہ مسائل کو حل کرنے کا جو طریقہ اور نثر پر فکری نقطۂ نظر سے جو بحثیں کتاب البرہان میں ملتی ہیں، ان کا پتہ تیسری بلکہ چوتھی صدی ہجری تک کی کسی کتاب میں نہیں چلتا، کتاب البرہان کی پوری اہمیت اس حصہ سے ظاہر نہیں ہوتی ہے جو "نقد النثر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جب اس کا باقی دو تہائی حصہ شائع ہوگا اُس وقت کتاب کے مباحث کی تصویر سامنے آسکے گی۔

---

[۱] نقد النثر. ملاحظہ ہو طٰہٰ حسین کا مقدمہ (مقدمہ فی البیان العربی)

انتخابات شبلی

شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی

(استدراک)

از جناب محمد ایوب قادری صاحب ایم اے

جناب ڈاکٹر لطیف حسین ادیب بریلوی کا ایک فاضلانہ مقالہ حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلویؒ پر معارف اعظم گڈھ، جلد ۹۴ شمارہ نمبر ۵ (نومبر ۱۹۶۴ء) میں شائع ہوا ہے، فاضل مقالہ نگار نے حضرت نیاز بریلوی کی شاعری پر اچھوتے انداز میں تعارف و تبصرہ فرمایا ہے، اس مقالہ کے آخر میں لکھا ہے[۱]:-

"خانقاہ نیازیہ کے ذخیرۂ نوادرات میں تھوڑا عربی کلام مزید محفوظ ہے جو زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا"

اگر ڈاکٹر صاحب خانقاہ نیازیہ سے حضرت نیاز کے عربی کلام کا کچھ نمونہ حاصل کر کے اس مقالہ میں شامل فرما دیتے تو علمی دنیا پر احسان ہوتا، اور ان کے دعوی کا ثبوت بھی فراہم ہو جاتا، ہندوستان و پاکستان کے بعض دانشور، ذاتی حیثیت سے اور کچھ لوگ یونیورسٹیوں میں ہندوستان کے عربی شعراء و ادبا پر تحقیقی کام کر رہے ہیں، ان میں حضرت نیاز بریلویؒ بھی عربی شاعر و ادیب کی حیثیت سے متعارف ہو جاتے اگر ممکن ہو تو آیندہ معارف میں حضرت نیاز کا کچھ عربی کلام شائع فرما دیں تاکہ لوگ استفادہ کر سکیں۔

---

[۱] معارف اعظم گڈھ ماہ نومبر ۱۹۶۴ء ص ۳۹۲

مندرجۂ بالا اقتباس میں "کلام عربیہ" پر ڈاکٹر صاحب نے مندرجۂ ذیل حاشیہ لکھا ہے جو اصل میں اس استدراک کے لکھنے کا محرک ہوا، حاشیہ ملاحظہ ہو[1]:-

"ہمارے فاضل دوست جناب ایوب قادری نے اپنی کتاب "مولانا فیض احمد بدایونی" میں مولوی عبدالقادر بدایونی کی کتاب تحفۂ فیض کے حوالہ سے حضرت شاہ نیاز احمد نیاز کو عربی شاعری میں مولانا فیض احمد بدایونی کا شاگرد بتایا ہے، ہمیں یہ بات ماننے میں تامل ہے، مولانا فیض احمد بدایونی کی پیدائش ۱۸۳۶ء میں ہوئی تھی، اس وقت نیاز کی عمر ۹۴ سال تھی، اس کے بعد جب مولانا فیض احمد بدایونی شعر گوئی کے سن و شعور کو پہنچے تو وہ حضرت نیاز کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا، عمر کے اس تفاوت سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نیاز نے مولانا بدایونی سے عربی اشعار میں اصلاح کے لیے رجوع نہیں کیا، جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے حضرت شاہ نیاز احمد نیاز نے فارسی، اردو، عربی شاعری میں صرف اپنی فکر کو اپنا رہنما بنایا اور کسی ہم عصر کے آگے زانوئے شاگردی تہ نہیں کیا۔"

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب کو اس سلسلہ میں تسامح ہوا ہے، میں نے "حضرت شاہ نیاز احمد نیاز (بریلوی) کو عربی شاعری میں مولانا فیض احمد بدایونی کا شاگرد" نہیں بتایا ہے اور ڈاکٹر صاحب نے جو اشکال پیش کیے ہیں وہ بالکل درست ہیں، میں نے مولانا فیض احمد بدایونی کے تلامذہ میں جن صاحب کا ذکر کیا ہے، ان کا نام مولوی نیاز احمد نیاز ہے، حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی نہیں ہے اور وہ حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی کے علاوہ ایک دوسرے شخص متوطن بدایوں ہیں، حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی ہندوستان کے مشہور و معروف صوفیا، ومشائخ میں شمار ہوتے ہیں، ان کا نام "مولوی نیاز احمد نیاز" نہ کبھی تحریر ہوا اور نہ اس طرح لکھا جاتا ہے

[1] معارف ا، نومبر ۱۹۶۴ء ص ۳۹۲

ان کے نام کے ساتھ "شاہ" اور "بریلوی" ضرور ہوتا ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب نے "مولوی نیاز احمد نیاز (بدایونی) کو حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی کس قرینہ سے سمجھ لیا، میں نے لکھا ہے[1]:-

"شعراء میں آپ (مولانا فیض احمد بدایونی) کے مستفیض مولوی فضل الدین قیس، مولوی غلام شاہد فدا، مولوی احمد حسین وحشت، مولوی نیاز احمد نیاز اور مولوی اشرف علی نفیس وغیرہ مشہور لوگ ہوئے ہیں۔"

اور حوالہ کے سلسلہ میں راقم نے لکھا ہے[2]:

"ان حضرات کے مختصر حالات اکمل التاریخ جلد اول، تحفۂ فیض اور طوالع الانوار میں کم و بیش ایک ہی عبارت کے ساتھ درج ہیں۔"

ان اقتباسات میں کہیں یہ درج نہیں ہے کہ بحوالہ تحفۂ فیض مولفہ مولوی عبدالقادر بدایونی حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی، عربی شاعری میں مولانا فیض احمد بدایونی کے شاگرد ہیں،

اکمل التاریخ مولفہ محمد یعقوب ضیاء قادری بدایونی (مطبوعہ مطبع عثمانی بدایوں ۱۹۱۵ء)

تحفۂ فیض مولفہ مولوی عبدالقادر بدایونی (مطبوعہ فخر المطابع میرٹھ، سنہ طباعت ندارد)

اور طوالع الانوار مولفہ مولوی انوار الحق بدایونی (مطبوعہ صبح صادق پریس سیتاپور ۱۲۸۹ھ)

یہ تینوں کتابیں مولانا فیض احمد بدایونی کے ماموں، خسر اور استاذ مولانا فضل رسول بدایونی (ف ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء) کے حالات میں ہیں، ان کتابوں میں بدایوں کے بہت سے علماء، ومشاہیر اور ادباء وشعراء کا ذکر مختلف عنوان سے آگیا ہے، میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب کو ان ماخذوں کی طرف بھی رجوع کرنا چاہیے تھا، ڈاکٹر لطیف حسین صاحب کو نام کے اشتراک کی وجہ سے

[1] مولانا فیض احمد بدایونی از محمد ایوب قادری ص ۳۰۰ (پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۵۶ء) [2] ایضاً

تسامح ہوا، ورنہ اس حاشیہ کے لکھنے کی مطلق ضرورت نہ تھی۔

حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی کے سلسلہ میں ایک اہم ماخذ مجموعۂ نغز تالیف حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم ہے، قدرت اللہ قاسم نہ صرف حضرت نیاز بریلوی کے معاصر بلکہ کسی حد تک استاد بھی ہیں، غالباً ڈاکٹر لطیف حسین صاحب کے پیش نظر یہ تذکرہ نہیں رہا ہے، اس تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نیاز نے علوم رسمیہ اور فنون کسبیہ کی تحصیل میں بہت محنت برداشت کی اور اس میں وہ خواجہ احمد خاں کے شاگرد ہیں، خواجہ احمد خان اس زمانے میں دہلی کی محفل سخن کے نامور استاد تھے، اور حضرت نیاز نے بھی شاعری میں ان ہی سے استفادہ فرمایا، مجموعۂ نغز کا اقتباس ملاحظہ ہو:[1]

"میاں نیاز احمد سلمہ اللہ الصمد تولدش در قصبہ سرہند و نشو و نمائے وے در شاہجہان آباد عمانہا اللہ عن الشر و الفساد واقع شدہ، مرد فاضل و صاحب ذہن سلیم و تخص عالم و پاک طبع قدیم است، مشقتہائے بسیار در تحصیل علوم رسمیہ کشیدہ و محنتہائے بے شمار در استحصال فنون کسبیہ بوے رسیدہ شاگرد رشید جبر محقق محل مدقق مرجع طلاب جہاں مولوی خواجہ احمد خان است غفرہ اللہ المنان واسکنہ بحبوحۃ الجنان، در ادانے کہ ایں خاک پائے طلاب جہاں چیزے ہم چیزے بودہ کتابے چند ازیں خاکسار نیز تکرار نمودہ۔"

شاید یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہو کہ شاعری میں خواجہ احمد خاں کے شاگرد محمد میر اثر (برادر خواجہ میر درد) اعظم خاں اعظم، غلام ناصر جراح، صدر الزماں مولوی اسمٰعیل فدا المخاطب بہ عاقبت محمود خاں اور قدرت اللہ قاسم جیسے دہلی کے مشہور لوگ تھے۔[2]

---

[1] مجموعۂ نغز: از قدرت اللہ قاسم ج دوم ص ۲۸۸، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۳ء

[2] ملاحظہ ہو مجموعۂ نغز ج اول ص ۴۳، ۶۵، ۱۵۵، ۱۶۵، ۱۹۳۔

حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی نے علوم دینیہ کی تکمیل حضرت مولانا شاہ فخر الدین دہلوی (ت ۱۱۹۹ھ) سے فرمائی ہے،[1]

ڈاکٹر لطیف حسین صاحب نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے:[2]

"مولانا فخر الدین کے حکم کے بموجب بریلی پہنچے، مسجد بی بی کے جنوبی حجرے میں قیام فرمایا، رام پور بھی گئے، جہاں حضرت شاہ عبد اللہ قادری کے دست مبارک پر بیعت کی۔"

شاہ نیاز احمد صاحب نے شاہ بغدادی سے رام پور میں نہیں بلکہ دہلی میں بیعت کی، اس کے بعد وہ بریلی پہنچے، چنانچہ قدرت اللہ لکھتے ہیں:[3]

"در آخرہا دست بیعت بدست حق پرست سید عبد اللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ از اولاد امجاد حضرت ذوالسانین امام الفریقین غوث صمدانی محبوب سبحانی قدس سرہ العزیز بغدادی المولد بودند، دادہ و مثال اجازت ارشاد طالبان و خرقۂ خلافت تربیت سالکان یافتہ بہ تعلیم طلباء و ارشاد در بلدۂ بریلی نشستہ فقیرانہ ایام بکام دل بسر می برد گاہ شعر فارسی صوفیانہ و ریختہ فقیرانہ می گوید"

شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی کے سوانح نگار نصیر الدین حسین قادری اور کرامات نظامیہ کے مؤلف حافظ محمد فائق نے بھی حضرت نیاز بریلوی کا شاہ بغدادی سے دہلی میں بیعت ہونا لکھا ہے[4] ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے۔[5]

---

[1] ناز و نیاز: حصہ اول (حالات شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی) [2] معارف اعظم گڈھ ماہ نومبر ۱۹۶۴ء ص ۳۸۰-۳۸۱

[3] مجموعۂ نغز: جلد دوم ص ۲۸۸ [4] ملاحظہ ہو ناز و نیاز ص ۸، ۱۲ و کرامات نظامیہ از حافظ محمد فائق ص ۱۹-۲۶ (مطبوعہ ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء) [5] معارف نومبر ۱۹۶۴ء ص ۳۸۱

"حضرت شاہ صاحب کو حدیث نبوی میں خصوصی عبور حاصل تھا جس کا درس وہ تمام عمر دیتے رہے۔"

حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی برصغیر پاک و ہند میں ایک شیخ طریقت اور صوفی شاعر کی حیثیت سے متعارف و مشہور ہیں اور ان کا ذکر بھی مشائخ کے تذکروں مثلاً خزینۃ الاصفیاء (غلام سرور لاہوری) مناقب فریدی (احمد اختر مرزا) تذکرۂ غوثیہ (غوث علی پانی پتی) تذکرۂ اولیائے ہند (احمد اختر مرزا) اور تاریخ مشائخ چشت (پروفیسر خلیق احمد نظامی) میں صوفی ہی کی حیثیت سے ملتا ہے، یا پھر شعراء کے تذکروں مثلاً ریاض الفصحا (مصحفی) مجموعہ نغز (قدرت اللہ قاسم) گلستان بے خزاں (باطن) گلشن بے خار (شیفتہ) اور تذکرہ سخن شعرا (نساخ) میں شاعر کی حیثیت سے ذکر ہے۔ علمائے محدثین کے زمرہ میں کہیں بھی حضرت نیاز بریلوی کا تذکرہ نہیں ملتا، اور برصغیر پاک و ہند کے محدثین کی اسناد میں ان کا ذکر آتا ہے،

خانقاہ نیازیہ نصیریہ[1] (بدایوں) کی طرف سے شائع شدہ ناز و نیاز اور خانقاہ نیازیہ نظامیہ[2] (بریلی) کی طرف سے نشر کردہ کرامات نظامیہ کتابیں بھی حضرت نیاز بریلوی کی اس حیثیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالتیں، اور اس باب میں یکسر خاموش ہیں، معلوم نہیں ڈاکٹر لطیف حسین ادیب صاحب نے یہ بات کس ماخذ سے لکھی ہے، اگر وہ ان کی محدثانہ حیثیت کو بھی تاریخی حوالوں سے ظاہر کردیں تو یہ ایک بڑی خدمت ہوگی۔

---

[1] حضرت نیاز بریلوی کے چھوٹے صاحبزادے نصیر الدین حسین (ف ۱۳۰۵ھ) بدایوں میں مقیم ہوئے، بدایوں ان کے رشد و ہدایت کا مرکز رہا اور وہیں ان کا انتقال ہوا،

[2] حضرت نیاز بریلوی کے بڑے صاحبزادے نظام الدین حسین (ف ۱۳۳۲ھ) نے بریلی میں رشد و ہدایت کا ہنگامہ برپا کیا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

خیر التواریخ کی روداد طباعت

شاہ جہاں پور

۲۵ر دسمبر ۶۴ء

ذوی المجد و الکرم جناب سید والا محترم! سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ

۱۱ر شعبان المعظم ۱۳۶۶ھ کا مکتوب گرامی از حضرت مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی بنام حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ دسمبر ۴۶ء کے معارف میں نظر سے گذرا، اس میں خیر التواریخ کا اشارہ دیکھکر دونوں بزرگوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی، چونکہ خیر التواریخ کے سلسلہ میں اس ناچیز کو دونوں گرامی قدر بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہے اس لیے مکتوب نے کیف کو دوبالا کر دیا، مکتوب کو بار بار پڑھا، طبیعت نے نہیں مانا کہ میں راز کو مزید اپنے سینے میں چھپائے رکھوں، اسی جذبہ کے تحت آپ کو حقیقت حال سے آگاہ کرنے کے لیے اس عریضہ کو تحریر کر رہا ہوں تاکہ خیر التواریخ کی جستجو کے لیے محققین کو جب کبھی ضرورت لاحق ہو تو وہ آپ سے رجوع کر سکیں۔

حقیقت حال | خیر التواریخ کی طباعت و اشاعت ابھی دور کی بات تھی، اس کی ترتیب و تدوین کا کام جاری تھا، اس کی تینوں جلدوں کے مسودات کا کم و بیش پانچ سیر وزنی پلندہ در صورت بستہ بغل میں دبائے ہوئے ہر چھوٹی بڑی تعطیل میں علی گڑھ کا چکر لگانا معمول میں داخل تھا، خوب یاد ہے ۲ر مارچ ۱۹۴۸ء کو سہ شنبہ کے دن حسن اتفاق سے شاہ جہاں منزل میں برادر گرامی سید الطاف علی صاحب بریلوی کے دولتکدہ پر حضرت مولانائے محترم حبیب الرحمن خاں شروانیؒ سے شرف نیاز حاصل ہوا،

سید الطاف علی صاحب میرے بچپن کے ساتھی اور ہم سبق ہیں، بہت دنوں سے مصر تھے کہ میں خیر التواریخ کو اشاعت کے لیے دیدوں، اس موقع پر وہی تعارف کا سبب بنے، نواب صاحب مرحوم نے مسودات کے صفحات ادھر ادھر سے الٹ پلٹ کر دیکھے، فرمایا "یہ بڑا عظیم الشان کام ہے، اس کو مولانا محمد علی مرحوم کرنا چاہتے تھے"۔ اسی طرح کے حوصلہ افزا کلمات خیر سے عزت افزائی فرمائی اور اصرار کیا کہ حبیب گنج آؤ تو تم میرا کتب خانہ دیکھو اور میں ان مسودات کو بالاستیعاب دیکھوں، چنانچہ نواب صاحب علیہ الرحمہ کی دعوت پر ۵ مئی تا ۱۱ مئی ۱۹۴۸ء ان کا مہمان رہا، چلتے وقت مقدمہ لکھنے کی استدعا کی، اس پر ضعف بصارت اور ثقل سماعت کا عذر پیش فرمایا لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک تعارف نامہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے نام عنایت فرمایا، اس میں خیر التواریخ پر مختصراً اظہار خیال فرماتے ہوئے مقدمہ لکھنے کی فرمائش تھی، یہ مکتوب غالباً آپ کو نہیں مل سکا، اگر اسے آپ شائع فرما دیتے تو ۱۱ شعبان المعظم ۱۳۶۷ھ کے مکتوب کے ان جملوں کی علت غائی کا پتہ چل جاتا کہ "خیر التواریخ پسند ہوئی، اس سے مسرت رہی، اچھا کام کیا ہے"۔

مقدمہ کی بات

حبیب گنج سے ۱۰ مئی ۱۹۴۸ء کو نواب صاحب علیہ الرحمہ علی گڑھ چلے آئے تھے، میں ۱۱ مئی ۱۹۴۸ء کو حبیب گنج سے علی گڑھ پہنچا، ۱۲ مئی کو جب رخصت ہونے لگا تو ازراہ ذرہ نوازی و علم پروری ایک ہزار روپیہ کا وعدہ فرمایا، شاہ جہاں پور واپس آکر میں نے ایک عریضہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کو جو اس وقت بھوپال میں مفتی اعظم تھے، لکھا، جواب میں مولانائے موصوف نے بھوپال پہنچنے کے لیے منع فرمایا، اور اپنا مکمل پروگرام تحریر کرتے ہوئے وقت متعین کیا کہ ۲۹ مئی ۱۹۴۸ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ملاقات ہوگی، چنانچہ ۲۹ مئی کو صبح ۸ بجے سے شام کو ۶ بجے تک خدمت اقدس میں حاضر رہا، یہیں پہلی بار مکرمی مولانا عبد الباری صاحب ندوی زید مجدہٗ سے شرف نیاز حاصل ہوا، وہ بھی شریک گفتگو رہے، شام کو جب رخصت ہونے لگا تو خیر التواریخ پر

بہرحال مقدمہ تحریر کرنے کا وعدہ فرمایا، ۶ شعبان المعظم ۱۳۶۷ھ کو جو مکرمت نامہ مولانا حبیب الرحمن شروانی کو موصول ہوا وہ یقیناً اسی سلسلہ میں ہوگا، جس کا جواب ۱۱ شعبان المعظم کو مولانائے مرحوم نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کو تحریر فرمایا۔

بہرحال خیر التواریخ کے مسودات کو صاف کرانے کے بعد دوسری جلد کا مسودہ چھپنے کے لیے مارچ ۱۹۴۹ء میں مسلم یونیورسٹی پریس کے حوالہ کر دیا، اس زمانہ میں سب سے اہم مسئلہ کاغذ کی فراہمی کا تھا، جو کنٹرول کے سبب بازار میں عنقا تھا، اس سلسلہ میں برادر گرامی سید الطاف علی نے جو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سپرنٹنڈنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ پریس کے منیجر بھی تھے، میری بڑی مدد فرمائی، انھوں نے پریس کی سہ ماہی کا کوٹہ میری تاریخ کے لیے وقف کر دیا، کتاب چھپنا شروع ہوگئی، وسط مئی تک کل ۸۰ صفحات کی طباعت ہوسکی، ۱۲ مئی ۱۹۴۹ء کو میں نے علی گڑھ پہنچکر کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، ۱۰ جون تک کتاب آدھی سے زیادہ چھپ گئی، علی گڑھ پہنچنے کے بعد ایک عریضہ اعظم گڈھ کے پتہ سے مخدومنا سید صاحب قبلہ کی خدمت میں بھیجا، اور مقدمہ کو جلد از جلد ارسال فرمانے کی استدعا کی لیکن جواب ندارد۔ غالباً ۱۲ جون کو بمبئی سے مکرمت نامہ موصول ہوا، اس میں حج بیت اللہ شریف اور اس کے بعد بلاد اسلامیہ کی سیر و سیاحت کا پروگرام درج تھا، اس طرح گویا چھ سات ماہ کے بعد مقدمہ لکھنے کی نوبت آتی۔ خلاف توقع اس تعویق سے مجھے پریشانی لاحق ہوئی۔ میں نے مکرمی جناب حضرت مولانا ضیاء احمد صاحب بدایونی سے جو اس وقت یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے پروفیسر تھے، مشورہ کیا، انھوں نے کتاب کی اہمیت کو مد نظر رکھکر نہایت خلوص کے ساتھ رہنمائی فرمائی کہ اس کتاب پر تو مقدمہ پروفیسر محمد حبیب صاحب لکھیں تو اچھا ہے، انھیں اس بات کا پتہ نہیں تھا کہ میں نے گذشتہ ۱۲ سال جو خیر التواریخ کے سلسلہ میں علی گڈھ کی آمد و رفت میں گذارے ہیں، یونیورسٹی کے کسی پروفیسر کو اس کی اطلاع نہیں کی، بجز ڈاکٹر سید معین الحق صاحب کے، وہ بھی آخر میں یہ وعدہ لیکر کہ وہ اسے

اپنے تک محدود رکھیں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر عام اطلاع کرتا تو اخلاقاً مجھ پر یہ عائد فرض ہوتا تھا کہ میں اپنے استاد محترم پروفیسر محمد حبیب صاحب سے اس پر مقدمہ لکھنے کی درخواست کرتا اور اس سے میں بچنا چاہتا تھا، اور اس کے لیے میرے نزدیک معقول وجوہ تھے، پہلی وجہ تو نظریاتی اختلاف کی تھی، خیر التواریخ کی پہلی جلد ۱۲ھ تا ۱۸۴۱ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے، استاد محترم کی تاریخ "محمود آف غزنہ" میرے پیش نظر تھی، اس جلد میں اکثر و بیشتر مقامات پر مجھے ان سے اختلاف ہے۔ دوسری وجہ ان کے متعلق عدم توجہی کی عام شکایت، مجھے احباب نے بتایا کہ وہ اتنے منہمک رہتے ہیں کہ آج تک انھوں نے کسی کتاب کے لیے چار حرف بھی نہیں لکھے، کتاب وہاں جاکر ردی کی ٹوکری میں پڑ جاتی ہے، بہر حال میں سمجھتا تھا کہ ان سے مقدمہ کے لیے درخواست کرنا بلا وجہ بحث و مباحثہ میں پڑنا ہے، مکرمی ضیاء احمد صاحب نے پہلی وجہ کو معقول سمجھتے ہوئے مکرمی شیخ عبد الرشید صاحب صدر شعبۂ تاریخ کا نام تجویز فرمایا، چنانچہ میں مطبوعہ فارموں کو کتابی شکل میں لیجاکر ان کے سپرد کر دیا، یہ ۱۲؍ جون ۴۹ء تک کی سرگذشت ہے۔

اب آگے کی داستان سنیے جو سب سے زیادہ پر لطف ہے۔ ۱۳؍ جون کو پریس کی تعطیل تھی، ۱۴؍ جون کو جو نئے فرمے چھپے، ان کا ایک ایک نسخہ لیجاکر محترمی شیخ صاحب کی خدمت میں پیش کیا، شیخ صاحب قبلہ بھی میرے استاد ہیں، انھوں نے انٹرمیڈیٹ میں مجھے تاریخ پڑھائی تھی، میں ان کا بڑا ادب و احترام کرتا ہوں اور وہ بھی مجھ پر بڑی شفقت فرماتے ہیں، اس مرتبہ جو میں حاضر ہوا تو استادی و شاگردی کی قدیم روایات کے خلاف غیر معمولی تپاک سے ملے، خیر التواریخ کے لیے مبارکباد دیتے ہوئے شکایت بھی کی کہ تم اتنے عرصے سے کام کر رہے ہو ہمیں اس کی اطلاع بھی نہیں کی، خیر یہ تو تھے دل خوش کن جملے، اب ذرا وحشت انگیز

جملے بھی سن لیجیے، کہنے لگے میں تمھارے کام سے بہت متاثر ہوا، یہ کام تو اتنا شاندار ہے کہ اس پر مقدمہ حبیب صاحب لکھیں اور یوں کہنے کو میں بھی لکھوں گا لیکن اس پر مقدمہ تو حبیب صاحب ہی کا ہوگا، میں نے اتنے صفحے پڑھ لیے ہیں، مجھے اتنے پسند آئے کہ میں پورا نسخہ لیجاکر حبیب صاحب کو دے آیا ہوں، وہ اس کا مطالعہ کر رہے ہیں، محترمی شیخ صاحب موصوف کے آخری توصیفی جملے سنکر میری کیا حالت ہوگی اس کا میں آپ کو کیسے اندازہ کراؤں، کاٹو تو بدن میں خون نہیں، دم بخود رہ گیا، ان کے سامنے وجوہ اختلافات کو پیش کرنے کی نہ ہمت تھی اور نہ اس کا موقع، ذہنی خلش ایک طرف اور شرم و ندامت کا بار گراں دوسری طرف، بار بار سوچتا تھا کہ میں اپنے محترم استاد کے سامنے کیا منہ لیکر جاؤنگا، کیا انھوں نے اس کو اپنی اہانت نہیں سمجھا ہوگا کہ خیر التواریخ کا نسخہ رشید صاحب کے پاس پہنچ جائے اور انھیں اس کی ہوا بھی نہ لگنے دیجائے، غرضیکہ بقیہ دن اور پوری رات اسی الجھن میں گذری۔

۱۵؍ جون ۴۹ء کو حسب معمول نماز فجر اور ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر کاتب کے یہاں پہنچا، اس سے کتابت کیے ہوئے جز وصول کیے اور مسودہ کے حسب ضرورت اوراق کتابت کے لیے دے کر سیدھا شاہجہاں منزل پہنچا، وہاں تصحیح کے لیے لکھے ہوئے جز ایک صاحب کو دے کر لٹن لائبریری پہنچا جہاں ۸ بجے سے ۱۱ بجے تک بیٹھکر مسودہ سے متعلقہ تاریخی کتب کا مطالعہ کیا کرتا تھا، یہ روزانہ کا معمول تھا، ۱۱ بجے لائبریری سے اٹھکر شاہجہاں منزل سے مصححہ جز لیکر پریس پہنچ جاتا تھا، اور وہاں شام کے چار یا پانچ بجے تک رہتا تھا، چنانچہ معمول کے مطابق لٹن لائبریری پہنچکر اپنے کام میں لگ گیا، قریباً دس بجے کا وقت ہوگا کہ کسی کے پیروں کی چاپ سنائی دی جو میری میز کے قریب آکر ختم ہوگئی، تھوڑی دیر کے بعد جو سر اٹھاکر دیکھا تو پروفیسر حبیب صاحب کھڑے ہوئے ہیں، وہ سندھ پر ایک مقالہ ترتیب دے رہے تھے، کتابوں کے انتخاب کے لیے ادھر آنکلے، انھیں دیکھکر دست بستہ مودبانہ کھڑا ہوگیا، ان کی زجر و توبیخ سننے کے لیے جس کا واقعات کی ترتیب نے مجھے مستحق بنا دیا تھا،

لیکن خلاف امید استاد محترم نے انتہائی بلند اخلاقی کا ثبوت دیا اور ایک جملہ بھی ایسا نہیں کہا جس سے مجھے ندامت محسوس ہوتی، برابر توصیفی کلمات سے ہمت بڑھاتے رہے، آخر میں اس حجاب کے پردہ کو جو اتفاقات کے الٹ پھیر نے درمیان میں حائل کر دیا تھا، یہ کہکر چاک کر دیا کہ اب تم مجھ سے کب لوگے؟ کیا آج شام کو انتظار کروں؟ چنانچہ اسی دن شام کو نئے چھپے ہوئے فرموں کے نسخے لیجا کر خدمت میں پیش کر دیے، اس کے بعد تو پھر ہر دوسرے تیسرے دن حاضری کا موقع ملتا رہا، مہینے کے آخر میں جبکہ کتاب کی طباعت قریب الختم تھی، ان سے مقدمہ لکھنے کے لیے درخواست کی جس کو بطیب خاطر منظور کرلیا، اور ۳ر جولائی کو صبح ۸ بجے کا وقت مقرر کر دیا، اس دن اتوار تھا، پریس کی تعطیل تھی، اسلیے مجھے بھی فرصت تھی، وقت معینہ پر جب پہنچا تو محترمی پروفیسر شیخ عبد الرشید صاحب وہاں پہلے سے موجود تھے، اور ایک دوسرے پروفیسر مسٹر ہارڈی بھی تشریف فرما تھے، مسٹر ہارڈی انگلینڈ میں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے پروفیسر تھے، ہندستان کے قرون وسطیٰ پر بسلسلۂ ریسرچ حبیب صاحب کے یہاں بحیثیت مہمان مقیم تھے، حبیب صاحب ہم تینوں کو ایک الگ کمرے میں لیجا کر فلسکیپ سائز کے نوٹ لکھ کر بیٹھ گئے، خیر التواریخ کا ایک ایک نسخہ ہم سب کے سامنے کھلا ہوا تھا، میری سیٹ ان کے قریب تھی، اس لیے ان کے نسخہ کی ایک ایک سطر پر میری نظر پڑتی تھی، اس دن میں ان کے عمیق مطالعہ کا قائل ہوگیا، خیر التواریخ کو انھوں نے خالص ناقدانہ انداز سے دیکھا تھا، کوئی صفحہ ایسا نہ تھا جس کی سطر پر نشان نہ لگائے ہوں، اور ضروری نوٹ نہ لیے ہوں، یہ نسخہ میں نے ان سے بدقت تمام حاصل کر کے اپنے کتب خانہ میں محفوظ کر لیا ہے، تاکہ دیکھنے والے اس سے مطالعہ کرنے کا سبق سیکھیں، بہر حال viva کا سلسلہ شروع ہوا، جو ایک بجے دوپہر تک جاری رہا، پی ایچ ڈی کے viva کی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں، جو نوٹ انھوں نے تیار کیے تھے وہ کٹ پٹ کر سب برابر ہو گئے، برائے بیت دو چار اختلافی باتیں رہ گئیں، جن کو میں نے اپنی کتاب کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔

پانچ گھنٹہ مسلسل بحث و تمحیص کے بعد شیخ صاحب قبلہ سے پوچھا "مقدمہ کے لیے کتنے صفحات ہونے چاہئیں"؟ دس پر بات ٹھہری، اس خیال سے کہ اردو میں ترجمہ ہونے کے بعد ۱۵ صفحے ہو جائیں گے، جو کافی ہیں، زیادہ پڑھتا کون ہے، سہ شنبہ تک لکھکر دیدینے کا وعدہ کیا، سہ شنبہ کو جب یاد دہانی کرائی گئی تو معلوم ہوا کہ بیس صفحے لکھے جا چکے ہیں، اور ابھی غالباً اتنے ہی صفحات اور لکھنا باقی ہیں، مختصراً یہ کہ کل ۸۰ فلسکیپ صفحات پر مقدمہ تیار ہوا جس کا خلاصہ انگریزی میں اور ترجمہ اردو میں خیر التواریخ کے اندر دیا جاسکا، اس لیے کہ ۱۹۴۹ء میں کاغذ کی قلت تھی، اور کتاب کا حجم اندازے کے بخلاف بجائے ۳۵۰ کے ۵۰۰ سے زائد ہوگیا تھا، بہرحال یہ ہے مختصر سی داستان خیر التواریخ پر مقدمہ لکھے جانے کی۔ اس سلسلہ میں ایک بات اور عرض کردوں، جو میرے لیے یقیناً باعث فخر ہے، اور وہ یہ کہ پروفیسر حبیب صاحب قبلہ نے خیر التواریخ سے پہلے کسی کتاب پر اتنا شاندار مقدمہ نہیں لکھا ہے، اس کے بعد شائع ہونے والی کتابوں پر تو ریویو دیکھنے میں آئے ہیں لیکن اس سے پہلے نہیں۔

نام میں تبدیلی اس ناچیز نے اپنے والد ماجد قبلہ حضرت مولوی محمد خیر الدین صاحب قادری کے نام نامی کی مناسبت سے اس تالیف کا نام خیر التواریخ تجویز کیا تھا، کتاب کے چھپنے سے پہلے اس کے مختلف مضامین جو مقالہ جات کی شکل میں شبنم بریلی، ماہنامہ عروج بدایوں، الفرقان لکھنؤ اور مصنف علی گڈھ میں شائع ہوئے وہ سب خیر التواریخ کے حوالے سے ہیں، "ذو القرنین" بدایوں نمبر میں مولوی محمد سلیمان صاحب مرحوم بدایونی نے مورخین کے ضمن میں اسی نام سے کتاب کو منسوب کیا ہے، ۱۹۴۹ء میں دوسری جلد کو طباعت کے لیے یونیورسٹی کے پریس کو جب دیا جانے لگا تو میرے محب مکرم سید عبد الرب صوفی ایم اے نے اس کا تاریخی نام "احسن التواریخ" رکھا، جس سے ۱۳۶۸ھ (مطابق ۱۹۴۹ء) نکلتی ہے، یہ نام بھی اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکا، اس لیے کہ اس نام کی ایک کتاب پہلے سے موجود ہے، نیز یہ کہ اس زمانہ میں ایسے ناموں کا چلن بھی بند ہے، بڑے بحث و مباحثہ کے بعد

علیگ بھائیوں نے اس کا نام "تاریخ ہندی قرون وسطیٰ" لکھا جو مطبوعہ شکل میں آپ کے سامنے ہے، اس کی دوسری جلد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پریس سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی تیسری جلد کا قریباً ½ حصہ "آستانۂ زکریا" ملتان نے مقالہ جات کی شکل میں شائع کیا، پہلی جلد مسودہ کی شکل میں محتاج طباعت و اشاعت ہے۔

معاف فرمائیں اختصار کے باوجود خط ذرا طویل ہو گیا، کیا کروں مجبوری تھی محض اس خیال سے کہ آیندہ آنے والی نسلیں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ کی علم پروری اور ذرہ نوازی سے سبق حاصل کریں، نیز یہ کہ خیر التواریخ کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں، یہ چند سطریں لکھنا پڑیں، اگر دستیاب ہو سکے تو معارف کی آیندہ اشاعت میں حضرت مولانائے محترمؒ کا وہ خط ضرور شائع کر دیجئے جو اس ناچیز کے توسط سے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی خدمت میں پہنچا تھا، افسوس ہے کہ اس کی نقل میرے پاس نہیں ہے، اور ہونے کا کوئی سوال بھی نہیں، اس لیے کہ لفافہ سربند تھا، اپریل ۶۵ء تک "تاریخ ہندی قرون وسطیٰ" پر جو تبصرے مجھے مل گئے تھے، انھیں شائع کر دیا ہے، سید عبدالرب صاحب عفا کا منظوم تبصرہ ضرور ملاحظہ فرمائیے، ارسال خدمت ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ غالباً جولائی ۱۹۶۴ء میں "زندگی کے دو اہم واقعات" کے دو نسخے خدمت اقدس میں روانہ کیے تھے، وصول یابی کی رسید میں تبصرہ فرمانے کا وعدہ تھا، اسی ماہ کے "صدق جدید" کے کسی نمبر میں حضرت مولانا عبدالماجد صاحب کے چند جملے نظر سے گذرے معاً آپ کا وعدہ یاد آگیا، اس لیے بطور یاد دہانی عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ کیا ایفائے وعدہ کا اب بھی مناسب وقت ہوا نہیں، زیادہ کیا عرض کروں، امید کہ بفضلہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ بھائی صباح الدین عبدالرحمٰن کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، صوفیائے کرام پر بڑا اچھا کام کر رہے ہیں، سلام مسنون عرض کر دیجئے۔ فقط والسلام مع الاکرام

نیاز مند

(الحاج) قاری محمد بشیر الدین پنڈت
ایم اے علیگ
محلہ بہادر گنج، شاہجہاں پور

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکتوب مولانا احمد علی صاحب لاہوری مرحوم

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

مخدومی و مکرمی حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب والا سے قرآن شریف کے حواشی کی اصلاح کی خط و کتابت گذشتہ شعبان ۱۳۶۴ھ میں ہوئی تھی، چنانچہ جناب والا کے ۲۱ شعبان والے مراسلہ کے جواب میں میں نے مندرجہ ذیل سطریں عرض کی تھیں،

"بفضلہ تعالیٰ مطبوعہ قرآن حکیم سارا ختم ہو چکا ہے، اس لیے اس کی دوبارہ کتابت عنقریب انشاء اللہ شروع ہونے والی ہے، قسم دوم کا میرا ذاتی نسخہ تھا، وہ ارسال خدمت ہے جو اصلاحات آپ فرما دیں انشاء اللہ تعالیٰ انھیں بسر و چشم منظور کر لوں گا۔

مودبانہ درخواست ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے اندر اس تکلیف کو گوارا فرما کر ممنون فرمائیں،

والسلام ۲۶ شعبان ۱۳۶۴ھ"

اس کے بعد پارہ الم کے چند صفحات کے متعلق اصلاحات کی پہلی قسط رمضان شریف ۱۳۶۴ھ کو آپ نے بذریعہ ڈاک ارسال فرمائی، جو مجھے ۵ رمضان ۱۳۶۴ھ کو وصول ہوئی، اس قسط کی

رسید کی اطلاع کے ساتھ میں نے مندرجہ ذیل عبارت عرض کی تھی :-

"اب آپ ایسے حضرات کرم فرمائی سے نظر ثانی فرمائیں تو میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔ خدا کرے کہ یہ مبارک کام رمضان شریف میں ختم ہو جائے۔" آمین،

اس کے بعد اصلاحات کی دوسری قسط اار رمضان المبارک سنہ ۴۲ھ میں جناب والا نے ارسال فرمائی، جس میں تمام سورہ بقرہ کے حواشی پر تبصرہ فرما دیا گیا تھا،

اپنی غلطی کا اعتراف اس دوسری قسط کے وصول ہونے کے بعد میں نے خدمت اقدس میں رسید کی اطلاع نہیں دی، اور میں اس خیال میں رہا کہ شاید آپ کو فرصت نہیں، اس لیے آپنے کوئی قسط ارسال نہیں فرمائی، اور ادھر قرآن مجید کی طباعت ثانیہ کی عجلت تھی، اس لیے کئی ماہ سے کتابت کے لیے قرآن مجید کاتب کے حوالہ کر دیا گیا تھا۔

تقریباً ساڑھے دس ماہ گذر نے کے بعد اب تین چار روز ہوئے مولانا عبد المجید صاحب سوہدروی مجھ سے ملے، اور انھوں نے ذکر کیا کہ حضرت سید صاحب سے میری ملاقات پٹنہ میں ہوئی تھی، اور انھوں نے فرمایا کہ احمد علی نے میری اصلاحی قسط کا کوئی جواب نہیں دیا، اس لیے میں نے حواشی پر نظر ثانی کرنا چھوڑ دیا ہے،

ان کی اس اطلاع کے بعد مجھے اس کا احساس ہوا کہ حضرت سید صاحب نے میرے عریضہ کے نہ پہنچنے کے باعث حواشی پر نظر ثانی چھوڑ دی، اور میں اس غلط فہمی میں رہا کہ آپ چونکہ عدیم الفرصت ہیں، اس لیے نظر ثانی چھوڑ دی ہو گی، اور تقریباً ساڑھے دس ماہ گزرنے کے باوجود کوئی قسط نہ آنے کے باعث کاتب کو سابقہ حواشی لکھنے اجازت دی گئی۔

میرے حواشی کا منبع عرض ہے کہ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم سے میں نے طالب علمی کے زمانہ میں سارا قرآن شریف پڑھا تھا، اس وقت وہ تردید شرک و بدعت اور اشاعت کتاب و سنت پر

زیادہ زور دیا کرتے تھے، اس کے بعد جب انھوں نے دہلی میں نظارۃ المعارف القرآنیہ قائم کی اس وقت واقعی ان کے ذہن میں دو چیزیں نمایاں تھیں، جن کا آپ نے اپنے اار رمضان المبارک کے گرامی نامہ میں ذکر فرمایا ہے،

سیاست و حکومت و سلطنت کا تخیل زیادہ قوت کے ساتھ ان کے ذہن میں تھا، اور مسلمانوں کی موجودہ سیاسی غلامی پر قناعت کے زہر کا تریاق اسی طریق تغیر کو قرار دیتے تھے، جناب والا کو یہ بھی یاد ہو گا کہ نظارۃ المعارف القرآنیہ کی کلاس میں پانچ گریجویٹس اور پانچ روشن خیال نوجوان عالم لیے گئے تھے،

اسی لیے مولانا مرحوم نے سیاست و حکومت و سلطنت کے تخیل کو مد نظر رکھ کر ہم لوگوں کو قرآن شریف پڑھایا تھا،

جملہ معترضہ یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ مولانا سندھی مرحوم کے قبل از ہجرت جو خیالات تھے، جن کی بنیاد خالص کتاب و سنت پر تھی، اور مسلک اسلاف سے نکلنا جرم عظیم سمجھتے تھے، میں فقط انھیں خیالات سے متاثر اور مستفید ہوں، بعد از ہجرت جو ان کے خیالات میں مذہباً یا سیاستہً تبدیلی آگئی تھی، میں اس سے ہرگز متفق نہیں ہوا، حالانکہ وہ مجھے اپنا ہم خیال بنانے میں مصر تھے، اسی لیے وہ مجھ سے آخر دم تک ناراض رہے، اور اسی مخالفت کے باعث بہت کچھ برا بھلا کہا کرتے تھے،

مولانا سندھی مرحوم کے خیال میں دوسری چیز ہندوستان کے سیاسی انقلاب کے علاوہ مولانا مرحوم یہ بھی چاہتے تھے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کے سیاسی ارتقاء کے جو منازل حجۃ اللہ البالغہ میں مرتب فرمائے ہیں، ان کی تائید کتاب اللہ سے بھی ہو جائے، تو نوجوانوں کے ذہن اس ارتقاء کے باعث حجۃ اللہ البالغہ کے فلسفہ کو بآسانی قبول کر سکیں گے، اس لیے انھوں نے تہذیب اخلاق

تدبیر منزل، سیاست مدنیہ، خلافت کبریٰ کے مضامین کو اپنی خداداد قابلیت کے ذریعہ سے قرآن مجید سے مرتب کر کے دکھایا، چنانچہ قرآن حکیم کے پہلے دس پارے حضرت مولانا مرحوم کے خیالات کا مرقع ہیں،

اشاعت سے قبل دو مرحلے | حضرت مولانا سندھی مرحوم سے قرآن مجید سننے کے بعد میں نے بفضلہ تعالیٰ ہندوستان بھر کے ایک ہزار علمائے کرام کو یہ مضامین آج تک سنائے ہیں، اور ان علماء میں مولانا شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد بہترین تلامذہ بھی ہیں،

اس کے علاوہ ان حواشی کی اشاعت سے پہلے میں نے ہندوستان کے چیدہ ترین علمائے کرام کی خدمت میں ان مسودات کو پیش کیا، ان میں سے آپ ایسے مقتدر و بلند پایہ حضرات بھی تھے، جنھوں نے میرے ان مسودات کو چیدہ چیدہ مقامات سے ملاحظہ فرما کر تقریظات لکھیں، اگرچہ آپ ایسے حضرات کی کرم فرمائی میرے لیے آیۂ رحمت الٰہی تھی، مگر میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ بعض جلیل القدر حضرات کو اول سے آخر تک ایک ایک لفظ پڑھوایا، اور انھوں نے اپنی تقریظ میں یہ فرمایا کہ ہم نے اول سے آخر تک ان حواشی کو پڑھا ہے، اور ان میں کوئی چیز مسلک اہل السنت والجماعت کے خلاف نہیں پائی، اس کے بعد بندہ نے جرأت کی کہ ان حواشی کو طبع کر کے شائع کیا جائے،

بعض تقاریظ کے اقتباسات | حضرت مولانا ابو محمد احمد صاحب مرحوم چکوالی جو شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اور مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی کے بہترین تلامذہ میں سے تھے تحریر فرماتے ہیں:۔

"خاکسار نے قرآن مجید مترجم طبع کردہ انجمن خدام الدین وفقہ اللہ تعالیٰ لخدمۃ الدین المتین، کا من اولہ الی آخرہ بنفسہ مطالعہ کیا بغرض تصحیح لفظ بلفظ پڑھا......... ربط آیات جس کے ضمن میں موضوع ہر سورہ قرآن حکیم، وخلاصہ جملہ رکوعات ہر سورہ، اور نمبر دار آیات سور کا سیاق وسباق سے ارتباط نہایت اختصار کے ساتھ ہر صفحہ کے حاشیہ کے حصہ اول پر لکھا گیا ہے، ایک نادر چیز ہے، جو میرے عزیز محترم جناب مولوی احمد علی صاحب سلمہ اللہ

امیر مجلس خدام الدین نے اپنی عمر کا معتد بہ حصہ صرف کر کے اساتذۂ باکمال کی تعلیم و تربیت سے حاصل کیا ہے، یہ حصہ بفضلہ فہم قرآن حکیم و تدبر آیات السمیع العلیم کے لیے ان شاء اللہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔"

حضرت مولانا حافظ سلطان محمود صاحب سابق شیخ الحدیث مدرسہ فتحپوری، دہلی تلمیذ اعلیٰ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں:

"میں نے علامہ موصوف کی اس تفسیر کو اول سے آخر تک نہایت غور سے دیکھا ہے، اور دیکھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے:

(۱) اول سے آخر تک کوئی بات ایسی نہیں پائی جو اہل السنت والجماعۃ کے مسلک کے خلاف ہو

(۲) ربط آیات کو اس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جس کی نظیر زمانہ ماضیہ میں عدیم الوجود ہے

(۳) مطالب و مضامین قرآن حکیم میں خیر الکلام ما قل و دل کے مطابق اختصار بھی ہے اور باوجود اختصار کے پیرائیہ بیان نہایت سہل و سلیس ہے، سمجھنے میں دقت پیش نہیں آتی۔"

مولانا عبید اللہ صاحب فاضل دیوبند تلمیذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"استاذی المکرم حضرت مولانا احمد علی صاحب کی تفسیر میں نے خود حضرت مولانا صاحب سے پڑھی ہے اور لکھی ہے، اور یہ تقریر حضرت مولانا کی لکھی ہوئی آپ کے ارشاد سے دیکھی ہے، میرے خیال میں صیغۂ ربط آیات میں یہ تقریر بے نظیر ہے........ تمام قرآن کریم کے مضامین کو ایسا مربوط بیان کیا ہے کہ اول سے آخر تک ایک نہایت لطیف نظام ربط قائم ہو گیا ہے۔ الخ"

حضرت مولانا غلام صدیق صاحب فاضل دیوبند تلمیذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا مولوی احمد علی صاحب کی تالیف دربارہ ربط آیات سورہ فاتحہ سے آخر تک لفظ بلفظ دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تو اس کو نہایت مفید پایا اور اس میں کوئی چیز خلاف اہل السنۃ والجماعۃ

کے نہیں دیکھی، احقر تہ دل سے دعا کرتا ہے کہ خداوند کریم اس کو مقبول و منظور فرمائیں۔"

حضرت مولانا محمد چراغ صاحب فاضل دیوبند تلمیذ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ:

(جنھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کی ترمذی شریف کی تقاریر عربی میں ترتیب دی ہیں، جو العرف الشذی کے نام سے طبع ہو چکی ہے) ارشاد فرماتے ہیں:

"حضرت علامہ مولانا احمد علی صاحب کی ربط آیات کی تحریر مجھے ابتداء سے لیکر آخر تک بالاستیعاب دیکھنے کا شرف حاصل ہوا، میرے خیال میں حضرت مولف کی عرق ریزی صلہ تحسین حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتی، ربط آیات کے سلسلہ میں بہت سے مضامین بے حد دلچسپی کا سامان مہیا کر دیے ہیں الخ"

عرض | یہ ہے کہ بندہ نے اپنے حواشی قرآن مجید کی طباعت سے پہلے دور حاضر کے مستند اور مقتدر علمائے کرام اور اپنے واجب الاحترام بزرگوں کی خدمت میں پیش کیے ہیں (میرے بزرگوں کی فہرست میں جناب کی ذات گرامی بھی ہے)

الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ تمام حضرات نے میری ہمت افزائی فرمائی، اور مجھے ان حواشی کی طباعت اور اشاعت کی جرأت ہوئی، اب میں تحدیہ خیال کرتا ہوں:

ز من تنہا دریں میخانہ مستم
جنید و شبلی و عطار ہم مست

دو حصے | میرے حواشی کے دو حصے ہیں، ایک حصہ درجہ تفسیر کے نام سے موسوم ہو سکتا ہے، جس میں اہل السنۃ والجماعت کے مسلک کی پابندی کو ضروری خیال کرتا ہوں، لہذا یہ ممکن ہے کہ کوئی چیز میرے قلم سے ایسی لکھی گئی ہو جو مسلک اہل سنت والجماعت کے خلاف ہو، اس کے متعلق متنبہ فرمائیں، انشاء اللہ اس کی اصلاح کر دی جائے گی۔

دوسرا حصہ الاعتبار والتاویل کا ہے، اس میں میں خیال کرتا ہوں کہ کسی پابندی کی ضرورت نہیں ہے، البتہ وہ مستنبط چیز کتاب وسنت سے کہیں معارض نہ ہو، اس معاملہ میں اہل حق کا اختلاف ہو سکتا ہے، اس درجہ میں ممکن ہے کہ ایک شخص اپنی رائے کو صائب سمجھتا ہو، اور اپنے مسائل مستنبطہ کو شرح صدر سے بیان کرتا ہے، اور دوسرے صاحب ان ہی چیزوں کو بعید از قیاس خیال کرتے ہوں جیسا کہ اعلیٰ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ حضرات صوفیائے کرام سارے قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مراد عقل اور فرعون سے مراد نفس لیتے ہیں، اور سارے قرآن مجید میں جہاں کہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ آیا ہے اسے عقل اور نفس کی لڑائی پر محمول کرتے ہیں، کیا یہ تفسیر بالرائے نہیں ہے؟

حضرت نے فرمایا کہ صوفیائے کرام اسے تفسیر نہیں کہتے، بلکہ الاعتبار والتاویل کے لحاظ سے ان دونوں شخصیتوں کی بجائے یہ دو چیزیں مراد لے لیتے ہیں، اور الاعتبار والتاویل کے لحاظ سے یہ جائز ہے۔

نتیجہ | اس سے معلوم ہوا کہ الاعتبار والتاویل کے میدان میں کافی وسعت ہے، ہاں یہ ضروری خیال کرتا ہوں کہ الاعتبار والتاویل کی کوئی چیز کتاب وسنت سے معارض نہ ہو۔

آخری استدعا | مودبانہ عارض ہوں کہ جناب والا اپنی بزرگانہ شفقت کا ہاتھ میرے سر پر بدستور سابق رکھیں اور دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ میری اس خدمت کو قبول فرمائے۔

میری محررہ سطور میری نجات اور خلق خدا کی ہدایت کا ذریعہ ہو، ہاں اگر کوئی چیز حصہ تفسیر میں کتاب وسنت سے معارض ہو جس کی اصلاح اشد ضروری ہے، اس سے مطلع فرمائیں، انشاء اللہ تعالیٰ ارشاد کی تعمیل ہوگی۔

البتہ اس میں بے حد عجلت کی ضرورت ہے، کئی ماہ سے قرآن حکیم کی کتابت ہو رہی ہے

متن اور حواشی کے لیے دو کاتب علیحدہ علیحدہ مصروف کار ہیں۔ فقط

احقر الانام

احمد علی عفی عنہ

۲۳ جون ۱۹۴۶ء

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی ہے، مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے، اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں، اور ساتواں زیر تالیف ہے۔

حصہ	صفحات		قیمت
حصہ اول	۴۴۴	صفحہ	لعہ
" دوم	۴۴۶	"	ہے
" سوم	۸۸۸	"	للعہ
" چہارم	۹۰۶	"	للعہ
" پنجم	۹۱۵	"	معہ
" ششم	۸۸۲		للعہ

پورے سٹ کے خریدار کو ۲۰ فیصدی کمیشن یعنی رعایتی قیمت ۵۶ ہو گی۔

منیجر

ادبیات

مدنی دربار میں

بہ تلمیحاتِ قرآنی

از جناب نکہت شاہجہاں پوری صدر شعبۂ فارسی ایس وجی ایف کالج شاہ جہانپور

رہبر ملت بیضا پہ درود اور سلام
صاحبِ یثرب و بطحا پہ درود اور سلام

تابِ قوسین کی محفل میں امینِ غم عشق
رہرو منزلِ اسریٰ پہ درود اور سلام

مرکزِ آیتِ لولاک لما خلقتُ الافلاک
نازشِ عرشِ معلیٰ پہ درود اور سلام

صاحبِ قوتِ جبرئیل و امینِ مصحف
آخریں مرسلِ والا پہ درود اور سلام

مالکِ خُلقِ عظیم و ملکِ لطفِ عمیم
بزم سیرت کے صف آرا پہ درود اور سلام

کس نے سمجھائے زمانے کو رموزِ الّا اللہ
شارحِ مسئلہ "لا" پہ درود اور سلام

اوّل ما خلق اللہ کے تابندہ گہر
نازشِ آدم و حوا پہ درود اور سلام

تاجِ "الفقر" سے شاہنشہ اربابِ دل
بانیِ مسلکِ صفّہ پہ درود اور سلام

لک ذکرک سے مشرف ہوئی دنیائے دلی
برکتِ انّ رفعنا پہ درود اور سلام

عالمِ رشد و ہدایت کے درخشاں خورشید
جلوۂ انّا فتحنا پہ درود اور سلام

ناطق ما اسئلکم اجری الّا باللہ
آپ کے اہل تولّا پہ درود اور سلام

بزم کونین کو سرسبز بنانے والی
جنت روضۂ خضرا پہ درود اور سلام

شرفِ بیعت[1] دیہ آپ کا دیرینہ غلام
نکہت و عالمِ رویا پہ درود اور سلام

---

[1] برسہا برس سے بیعت رسول کا متمنی تھا، عالم رویا میں یہ شرف حاصل ہوا، آپ نے بطور بشارت کے دریافت فرمایا "یہ کون" میں نے عرض کیا "میں ہوں آپ کا غلام"۔ اس پر مصافحۂ گرامی اور بیعت سامی سے نوازا گیا۔ فالحمد للہ علیٰ ھذا الشرف۔

غزل

از

جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

نظر سے دور ہے لیکن گماں سے دور نہیں
کوئی جہاں مری فکرِ جواں سے دور نہیں

یہ اور بات ہے دل کو شعورِ سجدہ نہ ہو
جبینِ شوق مگر آستاں سے دور نہیں

تری تلاش سے پہلے یہ جاننا ہے ضرور
کہاں سے دور ہو تو اور کہاں سے دور نہیں

ہزار دور سہی منزلِ فنا لیکن
یہ جانتا ہوں کہ عمرِ رواں سے دور نہیں

مرا چمن ہے مرے عالمِ تصور میں
قفس میں رہ کے بھی میں آشیاں سے دور نہیں

مری خموشیٔ پیہم میں ہے اثر ورنہ
مقامِ ضبط مقامِ فغاں سے دور نہیں

غمِ حبیب کی وسعت میں دو جہاں گم ہیں
غمِ حبیب غمِ لامکاں سے دور نہیں

قدم قدم مرا منزل شناس ہے جوہرؔ
کوئی مقام مِرے کارواں سے دور نہیں

سیرت عائشہؓ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات زندگی اور ان کے مناقب و فضائل و اخلاق اور ان کے علمی کارنامے اور ان کے اجتہادات و صنف نسوانی پر ان کے احسانات اسلام کے متعلق ان کی نکتہ سنجیاں اور معترضین کے جوابات

مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحومؒ ۔ ــــ صفحے (زیر طبع)

منیجر

مطبوعاتِ جدیدہ

مجمع الآداب فی معجم الالقاب۔ از ابن الفوطی، صفحات ۰۰۷، ٹائپ عمدہ، ناشر وزارت ثقافت شام۔

اسلامی تاریخ کی بے شمار نادر ہستیاں اپنے ناموں کے بجائے اپنے القاب سے مشہور ہیں، اور وہی القاب اہل علم کی زبانوں پر آتے ہیں، اور ایک ہی لقب کے متعدد حضرات گذرے ہیں، جس سے ان کے ناموں میں اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے اکابر امت کے تذکرے جس طرح تاریخ وفات اور ناموں کے لحاظ سے مرتب کیے گئے ہیں، اسی طرح القاب کے لحاظ سے بھی ان کے متعدد تذکرے لکھے گئے ہیں، انہی تذکروں میں ابن الفوطی کا تذکرہ مجمع الآداب فی معجم الالقاب بھی ہے، یہ تذکرہ بہت طویل تھا، اس لیے مصنف نے اس کا خلاصہ تیار کیا، اب تک یہ تذکرہ طبع نہیں ہو سکا تھا، اب اسے شام کی وزارت ثقافت نے شائع کیا ہے، اس کے دو حصے یعنی چوتھے و پانچویں کا اب تک پتہ چل سکا ہے، یہ کتاب کا چوتھا حصہ ہے، امید ہے کہ اس کا پانچواں حصہ بھی جلد شائع ہو جائے گا، دوسرے حصوں کا اب تک پتہ نہیں چل سکا ہے، اس کی اشاعت سے تذکرہ کے ذخیرہ میں ایک قیمتی اضافہ ہوا ہے، کتاب کے مصنف ابن الفوطی ساتویں صدی کے ممتاز علماء میں گذرے ہیں، اور انھوں نے متعدد اہم کتابیں تصنیف کی ہیں،

پارسی سرایان کشمیر۔ از ڈاکٹر گردھاری لال ٹِکو، صفحات ۱۹۲، ٹائپ اعلیٰ، ناشر انجمن ایران و ہند، تہران، پتہ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشن نئی دہلی۔

پارسی سرایان کشمیر ڈاکٹر گردھاری لال ٹیکو کی ادبی کاوش کا نتیجہ ہے، انھوں نے اس میں بیس ممتاز کشمیری شعراء کے فارسی کلام کا انتخاب پیش کیا ہے، اس میں غنی کاشمیری اور دوسرے شعراء کے ساتھ فیضی کے اس قصیدہ کو بھی جگہ دی گئی ہے جو اس نے کشمیر میں اکبر کی آمد پر کہا تھا، اس انتخاب میں مرتب نے دو باتیں پیش نظر رکھی ہیں، ایک یہ کہ کشمیر میں فارسی شاعری کی نوعیت کیا رہی ہے، دوسرے یہ کہ فارسی ادب کے ذخیرہ میں اس سے کیا اضافہ ہوا، یہ انتخاب دونوں حیثیتوں کے لحاظ سے قابل تحسین ہے، اس کی اشاعت ایک ادبی خدمت بھی ہے اور یہ ہند و ایران کے ثقافتی تعلقات میں اضافہ کا سبب بھی بنے گا

سفینۂ خوش گو ۔ از بند رابن داس خوش گو، مرتبہ سید عطاء الرحمن، صفحات ۴۰۰۔ کتابت وطباعت متوسط، ناشر ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ (بہار)

گیارہویں صدی میں ہندوستان میں اردو و فارسی شعراء کے جو تذکرے لکھے گئے، ان میں ایک سفینۂ خوش گو بھی ہے، اس تذکرہ میں مصنف نے ہندوستان کے ۲۰۰ سے اوپر فارسی شعرا کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے، اس کتاب کے تین حصے یا تین دفتر ہیں، یہ دفتر ثالث ہے، جس میں زیادہ تر مصنف کے معاصر شعراء کا تذکرہ ہے، بعض شعراء کے کلام کے انتخاب میں بہت اختصار سے کام لیا ہے، مگر ان کی خصوصیات شاعری پر جنچی تلی رائے دی ہے، مثلاً راجہ رام نرائن موزوں کے بارے میں لکھا ہے کہ

"در ہندی فارسی سلیقۂ درست بہم رسانید و نثر بسیار پاکیزہ می نگارد"

کاش ان کی نظم و نثر کے کچھ نمونے سامنے آتے تو یہ بڑے خاصے کی چیز ہوتی، اردو میں تو ان کو ایک شعر نے جو انھوں نے سراج الدولہ کی شہادت پر کہا تھا، زندہ کر رکھا ہے ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

مرتب اور ادارہ تحقیقات دونوں اس کی اشاعت پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

عندلیب تواریخ ۔ از خان بہادر مسعود حسن صاحب مسعود، صفحات ۳۱۰، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر ادارہ انیس اردو، ۴۴ چوک الہ آباد ۳

فن تاریخ گوئی ایک قدیم صنعت ہے، جس سے ماضی کی تاریخ اور اہم واقعات کے محفوظ رکھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، گویا یہ مختصر تاریخی ڈائری ہوتی ہے، بعض اہل علم کو اس میں بڑا ملکہ ہوتا ہے، وہ بے ساختہ نظم و نثر میں تاریخ نکال لیتے ہیں، مصنف کتاب ایک صاحب ذوق شاعر ہیں، ان کو بھی تاریخ گوئی میں کافی مہارت ہے، اسی مہارت فن کا اظہار انھوں نے عندلیب تواریخ میں کیا ہے، انھوں نے پانچسو سے زیادہ تاریخی قطعات کہے ہیں، سب سے پہلے انھوں نے راہ نمایان کانگریس کی تاریخ ولادت و وفات کو جگہ دی ہے، اس کے بعد ماضی و حال کے بہت سے بزرگوں، دوستوں کی شادی و غم اور ولادت و وفات اور دوسرے قابل ذکر واقعات کی منظوم تاریخیں کہی ہیں، ان کو قدرت نے شاعرانہ ذوق بھی عطا کیا ہے اس لیے زیادہ تر تاریخیں بامعنی، برجستہ اور رواں معلوم ہوتی ہیں، امید ہے کہ ان کے حلقۂ احباب کے ساتھ دوسرے اہل ذوق میں بھی مقبول ہوگی۔

ذکر جمیل ۔ از مولوی عثمان احمد صاحب قاسمی، صفحات ۷۰، کتابت وطباعت بہتر، پتہ: مدرسہ بدر الاسلام شاہ گنج، جونپور۔

علماء و صلحاء میں بہت سے ایسے صاحبان عزیمت گذرے ہیں، جو اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، انھوں نے گوشۂ تنہائی میں بیٹھکر دین و ملت کے اتنے بڑے بڑے کام کر ڈالے جو ایک جماعت مشکل سے کر سکتی ہے، ہندوستان میں دین کا بیشتر کام اسی نہج سے ہوا ہے، اور موجودہ دور میں اس کی شدید ضرورت ہے، مولانا جمیل احمد صاحب مرحوم جن کی یہ سوانح حیات ہے، انھوں نے بزرگوں کے اسی اسوہ پر چلنے کی کوشش کی تھی، وہ اپنے چچا مولانا دین محمد صاحب مرحوم کے ساتھ جو نحو کے مسلم استاد تھے اور جن کے ایک صاحبزادے مولوی محمد عرفان صاحب ندوی دار العلوم ندوہ کے قائم مقام مہتمم ہیں، شاہ گنج کے مدرسہ بدر الاسلام میں مدرس ہوئے، اور پھر وفات تک

اس سے اس طرح وابستہ رہے کہ دونوں لازم و ملزوم ہو گئے، ان کے ذریعہ قصبہ شاہ گنج اور قرب و جوار کے مواضع میں اصلاح حال اور تعلیم دین کی ترویج کا اچھا خاصا کام ہوا، ان کے پڑھائے ہوئے اور تربیت یافتہ سیکڑوں علماء و حفاظ موجود ہیں، اس کتاب میں ان کے ذاتی حالات اور ان کی علمی و دینی خدمات کے ہر گوشہ پر بڑے شگفتہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے، امید ہے کہ یہ کتاب ہر طبقہ میں شوق سے پڑھی جائے گی، خاص طور پر دین کے عملی کام کرنے والوں کے لیے اس میں بڑا سبق ہے، البتہ اتنی بات ضرور کھٹکتی ہے کہ مولانا نے بالکل اپنی ذات سے وابستہ کر رکھا تھا، یہ چیز کسی ادارہ یا جماعت کے لیے جتنی مفید ہوتی ہے اس سے زیادہ مضر ہوتی ہے،

زندگی کے دو اہم واقعات ۔ از قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت، صفحات ۹۸

کتابت و طباعت بہتر، پتہ نظامی بک ایجنسی، بدایوں، قیمت عہ

قاری بشیر الدین پنڈت صاحب ایک دیندار اور صاحب ذوق، فاضل اور عربی اور فارسی کے ساتھ سنسکرت سے بھی پوری طرح واقف ہیں، چنانچہ پنڈت ان کے نام کا جزو ہو گیا ہے، یہ متعدد علمی و تاریخی کتابوں کے مصنف ہیں، انھوں نے اس کتابچہ میں اپنی زندگی کے دو اہم واقعات کا بڑے دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے، ایک واقعہ حکومت کی طرف سے ان کو نیشنل ایوارڈ (قومی اعزاز) ملنے کا ہے، اور دوسرا واقعہ ان کے گھر میں رجنہ شیاطین کا اثر ہے، ان دونوں واقعوں سے اصلاً ان کے دوستوں اور تعلق رکھنے والوں کو زیادہ دلچسپی ہوگی، مگر دوسروں کے لیے بھی یہ واقعات غیر دلچسپ نہیں ہوں گے، قومی اعزاز کو اس حیثیت سے بھی انھوں نے قابل ذکر سمجھا ہے کہ یہ یوپی کے پہلے شخص ہیں جنھیں یہ ملا ہے اور پھر پنڈت صاحب کی کوشش کے بغیر ملا ہے، امید ہے کہ کتاب جس مقصد سے لکھی گئی ہے وہ پورا ہوگا۔

م ۔ ج

جلد ۹۵ ۔ ماہ شوال المکرم ۱۳۸۴ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۶۵ء ۔ عدد ۲

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۸۲-۸۴

مقالات

علامہ جلال الدین سیوطیؒ — از جناب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند — ۸۵-۱۰۸

ذخیرۂ ہادی بلگرامی کے چند مخطوطات — از جناب زیدی جعفر رضا صاحب ایم اے شعبۂ سنسکرت و ہندی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — ۱۰۹-۱۳۰

محمد بن تغلق کی فلسفہ پرستی — از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی رجسٹرار، امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش — ۱۳۱-۱۳۷

کلام اجمل یعنی مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی فارسی شاعری — از جناب پروفیسر نذیر واسطی لاہور — ۱۳۸-۱۴۷

آثار علمیہ و ادبیہ

مکاتیب عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحوم بنام مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ — ۱۴۸-۱۵۶

مطبوعات جدیدہ — م ۔ ج — ۱۵۷-۱۶۰